قَالَ اَلَمْ اَقُلْ لَّكَ اِنَّكَ لَنْ تَسْتَطِيْعَ مَعِيَ صَبْرًا ﴿۷۵﴾

کہا کیا میں نے تجھے نہیں کہا تھا کہ تو میرے ساتھ صبر نہ کر سکے گا۔

قَالَ اِنْ سَاَلْتُكَ عَنْ شَيْءٍۭ بَعْدَهَا فَلَا تُصٰحِبْنِيْ ۚ قَدْ بَلَغْتَ مِنْ لَّدُنِّيْ عُذْرًا ﴿۷۶﴾

(موسیٰ نے) کہا اگر میں تجھ سے اس کے بعد کسی بات کے متعلق سوال کروں تو مجھے اپنے ساتھ نہ رکھنا۔ تو میری طرف سے عذر (کی حد) کو پہنچ چکا۔(1948)

فَانْطَلَقَا ۫ حَتّٰۤى اِذَاۤ اَتَيَاۤ اَهْلَ قَرْيَةِ ِۨاسْتَطْعَمَاۤ اَهْلَهَا فَاَبَوْا اَنْ يُّضَيِّفُوْهُمَا فَوَجَدَا فِيْهَا جِدَارًا يُّرِيْدُ اَنْ يَّنْقَضَّ فَاَقَامَهٗ ؕ قَالَ لَوْ شِئْتَ لَتَّخَذْتَ عَلَيْهِ اَجْرًا ﴿۷۷﴾

پھر دونوں چلے۔ یہاں تک کہ جب ایک گاؤں والوں کے پاس آئے جہاں کے لوگوں سے کھانا طلب کیا تو انہوں نے انکار کیا کہ ان کی مہمانی کریں۔ پس انہوں نے اس میں ایک دیوار پائی جو گرا چاہتی تھی، تو (خضر نے) اسے کھڑا کر دیا (موسیٰ علیہ السلام نے) کہا اگر تو چاہتا تو اس کی مزدوری لے لیتا۔(1949)

1948 - **حضرت موسیٰ علیہ السلام کا اعتراف:** پہلے موقعہ پر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بھول جانے کا عذر کیا تھا۔ اس دوسرے موقعہ پر عذر نہیں کیا۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ سمجھ گئے ہیں کہ واقعی میری طبیعت ہی ان باتوں کو برداشت نہیں کر سکتی۔ لیکن وہ کہتے ہیں کہ ایک موقعہ مجھے اور دے دیا جائے اگر تیسری مرتبہ بھی میں برداشت نہ کر سکا تو معلوم ہوگا کہ اس علم کا حاصل کرنا میرے لیے موزوں یا مقدر ہی نہیں۔

1949 - ﴿يُّرِيْدُ اَنْ يَّنْقَضَّ﴾ مجاز کے طور پر ہے۔ گرنے کے قریب ہونے کو یوں ظاہر کیا گیا ہے کہ وہ ارادہ کر رہی تھی کہ گر پڑے۔ نیز [دیکھو نمبر: 1530]

دیوار کا واقعہ:

یہ تیسرا واقعہ ہے۔ پہلے دونوں میں بظاہر کوئی نقصان تھا مگر یہاں فائدہ پہنچایا گیا۔ تاہم یہاں اس لحاظ سے سوال پیدا ہوا کہ جو لوگ ادنیٰ احسان بھی مہمانوں کے ساتھ نہ کر سکے ان کے ساتھ کیوں بغیر معاوضہ لیے کوئی نیکی کی جائے۔

قَالَ هٰذَا فِرَاقُ بَيْنِيْ وَ بَيْنِكَ ۚ سَاُنَبِّئُكَ بِتَاْوِيْلِ مَا لَمْ تَسْتَطِعْ عَّلَيْهِ صَبْرًا ﴿۷۸﴾

کہا یہ مجھ میں اور تجھ میں جدائی ہے۔اب میں تجھے اس کی اصل حقیقت کی خبر دیتا ہوں جس پر تو صبر نہیں کر سکا۔

اَمَّا السَّفِيْنَةُ فَكَانَتْ لِمَسٰكِيْنَ يَعْمَلُوْنَ فِي الْبَحْرِ فَاَرَدْتُّ اَنْ اَعِيْبَهَا وَ كَانَ وَرَآءَهُمْ مَّلِكٌ يَّاْخُذُ كُلَّ سَفِيْنَةٍ غَصْبًا ﴿۷۹﴾

جو کشتی تھی وہ تو مسکین لوگوں کی تھی جو دریا میں مزدوری کرتے تھے۔تو میں نے چاہا کہ اسے عیب دار کر دوں اور ان سے پرے ایک بادشاہ تھا جو ہر ایک کشتی کو زبردستی پکڑ لیتا تھا۔(1950)

1950 - غَصْب۔ غَصب کسی چیز کے ظلم سے لینے کا نام ہے۔(ل) جِدَار کے لیے [دیکھو نمبر: 1338]

کشتی توڑنے کی وجہ:

اس سے معلوم ہوا کہ کشتی کو صرف عیب دار کر دیا گیا تا کہ اپنے عیب کی وجہ سے ظلماً لیا جانے سے بچ رہے۔تو یہ ایک پُر حکمت فعل تھا اور اس میں حضرت خضر علیہ السلام کو جو اطلاع تھی تو بوجہ حالت سے واقف ہونے کے تھی۔وحی کے ذریعہ سے یہ اطلاع دی گئی کہ کشتی کو پھاڑ کر بچاویں۔اسی کی طرف ﴿مَا فَعَلْتُهٗ عَنْ اَمْرِيْ﴾ میں اشارہ ہے۔اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کو مقامی حالات کا علم نہ ہونے کی وجہ سے یہ اطلاع نہ تھی۔اس لیے ان کے دل میں اعتراض پیدا ہوا۔

اس سے قومی نبوت کی ضرورت پر استدلال:

اس میں یہ بھی سمجھا دیا گیا ہے کہ جب قومیں الگ الگ پڑی ہوئی تھیں اور ایک دوسرے کے حالات سے باخبر نہ تھیں تو نبوتیں بھی مقامی ہو سکتی تھیں۔ایک قوم کا نبی دوسری قوم کے لیے ہدایت کا موجب نہ ہو سکتا تھا۔اس لیے کہ وہ ان کے حالات پر اطلاع پانے کے ذرائع نہ رکھتا تھا۔اور شاید یہی حضرت موسیٰ علیہ السلام کو سمجھایا گیا کہ کیوں ان کی نبوت بنی اسرائیل تک محدود ہے اور کیوں انہیں وہ علم نہیں دیا گیا جو اور قوموں کے لیے بھی موجب ہدایت ہو سکتا ہے۔اور قرآن کریم کے الفاظ تو بہت صاف ہیں کہ خضر علیہ السلام کو کچھ بھلائی کی باتیں سکھائی گئی تھیں جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کو نہیں سکھائی گئیں۔اور احادیث میں جو خضر کے لیے لفظ اعلم آیا ہے تو اس سے مراد یہ نہیں کہ انہیں وہ علم بھی حاصل تھا جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کو تھا اور اس سے بڑھ کر بھی کچھ علم حاصل تھا۔بلکہ مراد صرف اس قدر ہے کہ جو علم خضر علیہ السلام کو تھا وہ موسیٰ علیہ السلام کو نہ تھا اور جو موسیٰ علیہ السلام کو تھا وہ خضر علیہ السلام کو نہ تھا۔جیسا کہ حدیث کے الفاظ نے بھی واضح کر دیا [وَأَنْتَ عَلٰى عِلْمٍ عَلَّمَكَهُ اللّٰهُ لَآ أَعْلَمُهُ] (صحیح البخاری، کتاب العلم، باب مَا يُسْتَحَبُّ لِلْعَالِمِ إِذَا سُئِلَ اَىُّ النَّاسِ أَعْلَمُ فَيَكِلُ الْعِلْمَ إِلَى اللّٰهِ، حدیث: 122)

وَ اَمَّا الْغُلٰمُ فَكَانَ اَبَوٰهُ مُؤْمِنَيْنِ فَخَشِيْنَاۤ اَنْ يُّرْهِقَهُمَا طُغْيَانًا وَّ كُفْرًا ﴿۸۰﴾

اور جو جوان تھا تو اس کے ماں باپ مومن تھے تو ہم ڈرے کہ وہ انہیں سرکشی اور کفر میں مبتلا کر دے گا۔

فَاَرَدْنَاۤ اَنْ يُّبْدِلَهُمَا رَبُّهُمَا خَيْرًا مِّنْهُ زَكٰوةً وَّ اَقْرَبَ رُحْمًا ﴿۸۱﴾

تو ہم نے چاہا کہ ان کا رب انہیں صلاحیت میں اس سے بہتر اور رحم سے قریب تر (چیز) بدلہ میں دے۔ (1951)

1951 - **خضر کے حاکم ہونے پر استدلال:** خَشِيْنَا۔ خَشْيَةٌ کے لیے [دیکھو نمبر: 786] اور اس کے معنی میں بھی خوف کی طرح [دیکھو نمبر: 652] علم کا مفہوم پایا جاتا ہے اور خضر کا صیغہ جمع استعمال کرنا اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ ان کو حکومت حاصل تھی۔ کیونکہ جمع کا صیغہ واحد کے لیے عموماً ایسے موقعہ پر استعمال ہوتا ہے۔

رُحْمٌ۔ مَرْحَمَةٌ۔ رُحْمًا۔ رُحْمٌ۔ رَحِمَ سے مصدر ہے اور رَحمَة اور مَرحَمَة بھی اسی طرح مصدر ہیں ﴿وَ تَوَاصَوْا بِالْمَرْحَمَةِ﴾ [البلد: 17:90] ''اور ایک دوسرے کو رحم کی نصیحت کرتے ہیں۔'' (ل)

خضرؑ کے جوان کو قتل کرنے کی وجہ اس کا فساد اور ڈاکہ زنی تھی:

اس کی توجیہ مفسرین نے عموماً یہ کی ہے کہ حضرت خضر علیہ السلام نے ایک معصوم بچہ کو اس لیے مار ڈالا کہ بڑا ہو کر یہ اپنے والدین کے لیے کفر کا موجب ہو جائے گا۔ اس کی تردید میں اوپر [نمبر: 1947] میں کر چکا ہوں۔ زیادہ سے زیادہ یہی کہا جا سکتا ہے کہ حضرت خضر علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ علم دے دیا گیا تھا کہ بڑا ہو کر یہ لڑکا کافر ہوگا یا والدین کو بھی اپنی محبت کی وجہ سے کافر بنا دے گا۔ مگر اس بنا پر بھی جب سے اللہ تعالیٰ کا قانون دنیا میں نافذ ہوا کبھی کسی شخص کو قتل نہیں کیا گیا اور نہ کسی شریعت میں ایسے قتل کا جواز ہوا۔ اور یہ کہنا کہ یہ شریعت کی رو سے تو جائز نہیں مگر حقیقت کی رو سے جائز ہے، خود شریعت کی ہتک ہے۔ حقیقت زیادہ سے زیادہ اس بات کو کہا جا سکتا ہے کہ انسان کو ایک علم حاصل ہو جو دوسرے کو نہ ہو، اور بس۔ اگر خضر کو یہ علم ہو گیا تھا کہ یہ شخص قاتل یا ڈاکو یا مفسد ہے اور پھر انہوں نے اسے قتل کیا تو شریعت کے ماتحت یہ فعل ان کا آ جاتا ہے۔ لیکن اگر ان کو صرف یہ علم تھا کہ یہ بڑا ہو کر کافر یا مفسد بن جائے گا تو اس بنا پر کوئی شریعت، کوئی خدا کا قانون، کوئی انسان کا قانون اسے جائز نہیں ٹھہراتا۔ اور تعجب یہ ہے کہ آثار میں ایسی باتوں کے وجود ہوتے ہوئے جو امر اول کو ظاہر کرتی ہیں اور حضرت خضر علیہ السلام کے اس فعل کو بروئے شریعت جائز ٹھہراتی ہیں۔ مفسرین عموماً مراد دوم کی طرف ہی چلے گئے ہیں۔ آثار میں ہے کہ یہ جوان فساد برپا کرتا تھا اور ایک روایت میں ہے کہ ڈاکے مارتا تھا اور پھر اپنے ماں باپ کے سامنے قسم کھا دیا کرتا تھا کہ میں نے ایسا فعل کوئی نہیں کیا۔ تو وہ اس سے قصاص نہ لینے دیتے تھے اور اس کی حمایت کرتے تھے۔ (ر)

رَهِقَ۔ طُغْيَانٌ۔ خود قرآن شریف میں اول لفظ رَهِقَ موجود ہے اور اَرْهَقَ کے معنی ہیں [غَشِيَه بِقَهرٍ] (غ) [نمبر: 1390]

وَ اَمَّا الْجِدَارُ فَكَانَ لِغُلٰمَيْنِ يَتِيْمَيْنِ فِي الْمَدِيْنَةِ وَ كَانَ تَحْتَهٗ كَنْزٌ لَّهُمَا وَ كَانَ اَبُوْهُمَا صَالِحًا ۚ فَاَرَادَ رَبُّكَ اَنْ يَّبْلُغَآ اَشُدَّهُمَا وَ يَسْتَخْرِجَا كَنْزَهُمَا ۖ رَحْمَةً مِّنْ رَّبِّكَ ۚ وَ مَا فَعَلْتُهٗ عَنْ اَمْرِيْ ؕ ذٰلِكَ تَاْوِيْلُ مَا لَمْ تَسْطِعْ عَّلَيْهِ صَبْرًا ﴿۸۲﴾ ع 10 12 1

اور جو دیوار تھی، تو وہ شہر کے دو یتیم لڑکوں کی تھی اور اس کے نیچے ان دونوں کا خزانہ تھا اور ان کا باپ نیک تھا۔ سو تیرے رب نے چاہا کہ وہ اپنی قوت کو پہنچیں اور اپنا خزانہ نکال لیں۔ (یہ) تیرے رب کی طرف سے رحمت (ہوئی) اور میں نے اپنے اختیار سے یہ نہیں کیا۔ یہ اس کی اصل حقیقت ہے جس پر تو صبر نہ کر سکا۔ (1952)

یعنی زبردستی یا غلبہ سے ڈھا نک لینا۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ والدین پر بھی وہ کچھ جبر کرتا تھا۔ دوسرے لفظ طغیان موجود ہے جس کے معنی ہیں حد سے گزر جانا۔ تو یہاں کفر میں حد سے گزر جانے کا ذکر نہیں۔ کیونکہ کفر کا لفظ الگ بعد میں لایا گیا ہے۔ بلکہ فساد اور قانون کی نافرمانی میں حد سے گزرنا ہے اور ان معنوں میں یہ لفظ قرآن شریف میں بکثرت آیا ہے۔ جیسے ﴿فِيْ طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُوْنَ﴾ [البقرة: 15:2] ''اپنی سرکشی میں حیران پھر رہے ہیں۔'' جہاں پہلے ان کے [فَسَادٌ فِي الْاَرْضِ] کا ذکر ہے اور دوسرے کو طغیان میں وہی مبتلا کر سکتا ہے جو پہلے خود اس کا ارتکاب کرتا ہے۔ جس سے معلوم ہوا کہ واقعی یہ شخص مفسد تھا۔ تیسرے ﴿خَيْرًا مِّنْهُ زَكٰوةً﴾ بھی بتاتا ہے کہ اس میں صلاحیت نہ تھی اور چہارم ﴿اَقْرَبَ رُحْمًا﴾ سے ظاہر ہے کہ اس میں رحم نہ تھا۔ تو ان الفاظ قرآنی سے اور آثار سے صاف ظاہر ہے کہ یہ جوان کوئی مفسد تھا جو بوجہ اپنے والدین کی عزت اور مرتبت کے یا ان کی حمایت کے قانون کی گرفت سے بچا ہوا تھا اور اس کا فساد ظاہر رنگ میں اتنا عیاں نہ تھا۔ اس لیے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اعتراض ہوا۔ مگر حضرت خضر علیہ السلام کو بوجہ علم حالات اصل حقیقت سے آگہی بھی تھی اور اللہ تعالیٰ کا حکم بھی آ گیا کہ بغیر اس کے قتل کے اس کا فساد رفع نہیں ہو سکتا۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ واقعی اس کے جرم کی شہادت ظاہر طور پر نہ ملتی ہو اور حضرت خضر علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے اطلاع دی ہو۔ مگر الفاظ قرآنی سے یہ لازماً نتیجہ نہیں نکلتا۔ رہی یہ بات کہ اس کا کیا مطلب ہوا کہ اللہ تعالیٰ والدین کو اس سے بہتر صلاحیت اور قریب تر رحم والا بدلہ میں دے تو اس سے مراد یہ بھی ہو سکتی ہے کہ جب وہ ایک مفسد کی حمایت کو چھوڑ دیں گے تو یہ نہیں کہ اللہ تعالیٰ انہیں اور اولاد نہیں دے گا بلکہ یہی ان کا فعل اللہ تعالیٰ کو ایسا پسند آئے گا کہ اس سے بہتر اولاد ان کو دے دے گا اور یا زَكٰوةً کے معنی صرف پاکیزگی لے کر اچھے نتیجہ کی طرف اشارہ ہو سکتا ہے۔ یہاں بھی حضرت خضر علیہ السلام کو خاص حالات قومی کا علم ہے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کو نہیں۔

1952 - ﴿تَسْطِعْ﴾۔ اصل میں تَسْتَطِعْ ہے تائے افعال کو تخفیف کے لیے ساقط کر دیا گیا ہے اور یہاں بعض نے یہ نکتہ بیان کیا ہے کہ آخر میں تخفیف کی وجہ یہ ہے کہ اس بیان کے سبب سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے دل پر وہ بوجھ نہ رہا تھا جو پہلے تھا۔

بلا اجرت دیوار بنانے کی وجہ نا اہل لوگوں کے کسی بزرگ کی نیکی ہے:

دیوار بلا اجرت بنا دینے کی وجہ یہ بتائی ہے کہ گو انہوں نے خود تو ہمارے ساتھ اچھا سلوک نہیں کیا مگر ان کا والد نیک آدمی تھا۔ اس کی نیکی کی وجہ سے ان نا اہل لوگوں کے ساتھ بھی نیکی کرنا ضروری تھا اور اسی معاملہ کو ﴿رَحْمَةً مِّنْ رَّبِّكَ﴾ کہا ہے اور یہ بھی کہا ہے کہ میں نے اپنے اختیار سے ایسا نہیں کیا بلکہ اللہ تعالیٰ کے حکم کی تعمیل میں ایسا کیا ہے اور جعفر صادق رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ یہ ساتویں پشت میں ان کا جد امجد تھا جس کا ذکر یہاں ہے اور بعض نے کہا دسویں پشت میں۔ (ر) یہاں بھی حضرت خضر علیہ السلام کا خاص حالات قومی کا علم نظر آتا ہے گو تینوں جگہ خضر کے فعل کی وجہ امر الٰہی ہے اور ﴿مَا فَعَلْتُهٗ عَنْ اَمْرِیْ﴾ تینوں واقعات کے متعلق ہے۔

ذکر کَنْزَ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پیشگوئی:

حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت خضر علیہ السلام کے بیان کے شروع میں مَیں نے کہا تھا کہ اس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی صداقت کی طرف خاص اشارہ ہے اور یہ صرف میرا قیاس نہیں بلکہ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما اور سیدنا علی رضی اللہ عنہ اور دیگر سلف کے اقوال سے بھی مستنبط ہوتا ہے۔ اس آیت میں جو لفظ کَنْزَ آیا ہے اس کی ایک توجیہ مال و دولت تو ظاہر ہے۔ لیکن سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ یہ سونا چاندی نہ تھا بلکہ علم کے صحیفے تھے۔ اور یہی سیدنا علی رضی اللہ عنہ اور حضرت ابن جبیر اور سیدنا ابوذر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ اور سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما کی ایک روایت میں یہ صاف لفظ ہیں کہ یہ ایک سونے کی تختی تھی جس پر چند نصائح کے بعد آخری لفظ یہ تھے لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ (ر) تو اس صورت میں حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر بتاتا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام اور خضر کے بیان کی اصل غرض بھی یہی ہے کہ وہ رسول جو ہر قسم کے علوم کا جامع ہوگا اور جو ہر قوم کے لیے ہدایت لائے گا اور جسے رشد کی ساری راہیں بتائی جائیں گی وہ موسیٰ نہیں ہو سکتے۔ بلکہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ اور ﴿رَحْمَةً مِّنْ رَّبِّكَ﴾ میں اسی طرف اشارہ ہے۔

موسیٰ اور خضر علیہما السلام کے واقعات میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی صداقت کا اظہار:

اب خواہ خضر کو فرشتہ قرار دے کر ان واقعات کو حضرت موسیٰ علیہ السلام کا ایک کشف مانا جائے اور خواہ انہیں ایک نبی مان کر یہ ظاہری واقعات ہوں۔ دونوں صورتوں میں ان باتوں کے بیان کرنے کی اصل غرض کچھ اور ہے اور وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ذکر ہے اور اس کی طرف یہ آخری آیت صاف اشارہ کرتی ہے۔

واقعہ کشتی اور ملک عرب کی حالت:

پہلا واقعہ یہ ہے کہ ایک کشتی کو عیب دار بنایا گیا تھا تاکہ ایک ظالم بادشاہ اس پر قبضہ نہ کر لے۔ اس میں ملک عرب کی حالت کی طرف اشارہ معلوم ہوتا ہے جہاں سے آفتاب نبوت طلوع ہونا تھا اور کشتی کے ساتھ اسے مشابہت دینے کی غرض یہ ہے کہ جس طرح کشتی طوفان سے نجات دیتی ہے اسی طرح انبیاء کا پیغام بھی نجات عالم کا موجب ہوتا ہے۔ ملک عرب کے لیے اللہ تعالیٰ نے یہ پیغام اس لیے مخصوص کیا تاایک ریگستانی ملک فاتحین دنیا کے لیے کسی کشش کا موجب نہ ہو۔ اور وہاں ایک آزاد قوم پرورش پا کر دنیا میں خدا کے پیغام کی حامل بنے۔ یہودیوں اور عیسائیوں کا پہلا اعتراض اسلام پر یہی تھا کہ یہ نبی ملک

وَ يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنْ ذِي الْقَرْنَيْنِ ؕ قُلْ سَاَتْلُوْا عَلَيْكُمْ مِّنْهُ ذِكْرًا ﴿۸۳﴾

اور تجھ سے ذوالقرنین کے متعلق سوال کرتے ہیں۔ کہہ میں اس کا کچھ ذکر تم پر پڑھوں گا۔ (1953)

عرب میں کیوں ہوا۔

واقعہ قتل اور آنحضرت ﷺ پر بیگناہوں کے قتل کا جھوٹا الزام:

اور قتل غلام میں اس سب سے بڑے اعتراض کا جواب دیا جو یہودیوں اور عیسائیوں کو اسلام پر ہے کہ نبی ﷺ نے یہود کی ایک قوم کے بڑے بڑے آدمیوں کو قتل کرواڈالا۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہ لوگ مفسد تھے۔ اگر ان مفسدوں سے مدینہ کو پاک نہ کیا جاتا تو حق زندہ نہ رہ سکتا تھا۔ اور تیسرے واقعہ کو لاکر یہ بتایا ہے کہ وہ شخص جو بلا کسی اجرت کے لینے کے دن رات ان لوگوں کی اصلاح میں لگا رہتا ہے جو اس سے طرح طرح کی بدسلوکی کرتے ہیں وہ کسی کے خون کا پیاسا کب ہوسکتا ہے۔ وہ شخص جسے بادشاہت ملتی ہے تو وہ ایک فقیر کی طرح زندگی بسر کرتا ہے۔ وہ شخص جس کا دل انسانوں کے مصائب پر غم سے پگھلتا ہے بادشاہت کا خواہاں نہیں ہوسکتا، نہ کسی انسان کی دشمنی کا خیال اس کے دل میں آ سکتا ہے۔

واقعہ کنز اور آنحضرت ﷺ کے متعلق پیشگوئیاں:

اور دو یتیم غلاموں میں جن کا ایک خزانہ دیوار کے نیچے ہے۔ اشارہ یہود و نصاریٰ کی طرف ہے جن کے جد صالح حضرت ابراہیم علیہ السلام یا خود حضرت موسیٰ علیہ السلام ہیں اور ان کی دیوار سیدھا کر دینے سے مراد توریت و انجیل کا منجانب اللہ تسلیم کر لینا ہے۔ اور اس دیوار کے نیچے کَنْزٌ وہی پیشگوئیاں ہیں جن میں محمد رسول اللہ ﷺ کا ذکر ہے تاکہ یہ لوگ جب اپنے قوائے روحانی سے پورا کام لیں تو انہیں سمجھ آ جائے کہ واقعی توریت اور انجیل نے انہیں اسی طرف ہدایت کی تھی۔ آثار نے اس آخری بات کی طرف ہدایت کر کے سارے معاملہ پر صفائی سے روشنی ڈال دی ہے۔

نبوت خضر علیہ السلام:

﴿مَا فَعَلْتُهٗ عَنْ اَمْرِيْ﴾ خضر کی نبوت اور رسالت پر صریح دلیل ہے۔

1953 - **ذوالقرنین علیہ السلام کون تھے:** ذُوالْقَرْنَيْن۔ قَرْنَ کے معنی نسل بھی ہیں [دیکھو نمبر: 906] اور قَرْن سینگ کو بھی کہتے ہیں۔ ذوالقرنین کی وجہ تسمیہ میں بہت سی روایات ہیں۔ ابن جریر کہتے ہیں اہل کتاب کا اس میں اختلاف ہے۔ بعض کہتے ہیں وہ دو بادشاہتوں کا مالک تھا یعنی روم اور فارس کا۔ بعض کہتے ہیں کہ اس کے سر میں دو سینگوں سے مشابہ کوئی چیز تھی۔ بعض کہتے ہیں اس کے سر کی دونوں طرف تانبے کی تھیں۔ وہ کون تھا؟ مفسرین میں سے بعض نے اسے فرشتہ بھی کہہ دیا ہے۔ اکثر کا یہ قول ہے کہ وہ ایک عبد صالح تھا جسے اللہ تعالیٰ نے حکومت بھی دی تھی اور اسے علم و حکمت اور ہیبت دی تھی۔ اور بعض اس کی نبوت کے بھی قائل ہیں۔ مگر اس کی تعیین کسی نے نہیں کی کہ کون تھا۔ اس عقدہ کا حل بائبل سے ہوتا ہے جہاں دانیال کی رؤیا میں دو سینگ کے مینڈھے کا ذکر ہے اور اس کی تعبیر بھی وہیں موجود ہے:

اِنَّا مَكَّنَّا لَهٗ فِى الۡاَرۡضِ وَ اٰتَيۡنٰهُ مِنۡ كُلِّ شَىۡءٍ سَبَبًا ﴿۸۴﴾

ہم نے اسے زمین میں طاقت دی تھی اور ہر قسم کا سامان اسے دیا تھا۔(1954)

''وہ مینڈھا جسے تو نے دیکھا کہ اس کے دو سینگ ہیں سو ماوہ اور فارس کے بادشاہ ہیں۔''[دانیال: 20:8]

ماوہ اور فارس کے باشاہوں میں سے دارائے اوّل (521-485 قبل مسیح) وہ شخص ہے جس پر قرآن شریف کا بیان جو یہاں ذوالقرنین کے متعلق ہے صادق آتا ہے۔ چنانچہ جیوش انسائیکلو پیڈیا (دائرۃ المعارف یہود) میں اس کے متعلق لکھا ہے کہ

''دارا ایران کی شہنشاہیت کی تنظیم کرنے والا تھا۔ اس کی فتوحات نے اس کی سلطنت کی حدود کو آرمینیا اور کوہ قاف اور ہندوستان اور تورانی پہاڑوں اور وسط ایشیا کے مرتفع میدانوں میں درست کر دیا۔''

اور انسائیکلو پیڈیا برٹینیکا میں ہے:

''دارا اپنے کتبوں کی رو سے زرتشت کے سچے مذہب کا پکا پیرو کار معلوم ہوتا ہے۔ مگر وہ بڑا مدبر اور بڑا منتظم بھی تھا۔ فتوحات کا وقت انجام کو پہنچ گیا تھا اور دارا نے جو لڑائیاں اختیار کیں ان سے یہ فائدہ ہوا کہ سلطنت کے لیے مضبوط قدرتی حدود مل گئیں اور اس کی حدود پر جو وحشی اقوام تھیں ان کی طرف سے امن ہو گیا۔ چنانچہ دارا نے پانٹک اور آرمینیا کے پہاڑوں کی وحشی اقوام کو مسخر کیا اور سلطنت ایران کی حدود کو کوہ قاف تک وسیع کیا۔ اسی وجہ سے اس نے ساسی اور دوسری تورانی قوموں سے بھی لڑائی کی۔''

ان باتوں کا جو یہاں بیان ہوئی ہیں اگر قرآن کریم سے مقابلہ کیا جائے تو صاف نظر آ جائے گا کہ قرآن کریم نے ذوالقرنین کے نام سے جو دانیال کی رؤیا کی بنا پر اس کا نام تھا، دارائے اول کا ہی ذکر کیا ہے اور اس میں بھی قرآن کریم کے کمال علم پر دلالت ہے۔

ذوالقرنین کے یہاں ذکر کی وجہ:

اور اس کے یہاں ذکر کی ایک وجہ تو یہ بھی معلوم ہوتی ہے کہ یہ بھی ایک قوم کا نبی تھا اور یوں یہود اور نصاریٰ کو یہ بتایا ہے کہ نبوت ان کی قوم سے مخصوص نہیں۔ دوسری قوموں کے انبیاء کا ذکر کرنے میں شاید یہ بھی سمجھانا مقصود ہو کہ یہود اور نصاریٰ جو نبی آخر زمان کے عرب میں سے ہونے پر معترض تھے انہیں بتایا جائے کہ نبوت خدا کی ایسی نعمت نہیں جسے اس نے بنی اسرائیل سے مخصوص کیا ہو۔ اور دوسرے چونکہ ذوالقرنین کا ذکر یاجوج ماجوج کے ذکر پر ختم ہوتا ہے اور ساتھ ہی یاجوج ماجوج کے آخری زمانہ میں خروج کا بھی ذکر ہے اور یاجوج ماجوج عیسائی اقوام ہیں اس لیے اس ذکر کو اس سورت کے ساتھ خاص مناسبت ہے۔

1954 - سَبَبٌ ہر ذریعہ کو کہتے ہیں جس سے دوسری چیز کی طرف پہنچا جائے [دیکھو نمبر: 204]۔ اور یہاں راغب نے مراد ہر چیز کی معرفت اور اس کا ذریعہ لیے ہیں۔ اور ابن جریر نے علم معنی لیے ہیں۔ اور اگلی آیت میں سبب کے معنی یا تو ذریعہ یا سامان ہی ہیں اور مراد ہے سامان سفر اور یا اس کے معنی منزل اور طریق یعنی رستہ ہیں۔ (ج)

فَاَتْبَعَ سَبَبًا ﴿۸۵﴾

سو وہ ایک راہ پر چلا۔

حَتّٰۤى اِذَا بَلَغَ مَغْرِبَ الشَّمْسِ وَجَدَهَا تَغْرُبُ فِىْ عَيْنٍ حَمِئَةٍ وَّ وَجَدَ عِنْدَهَا قَوْمًا ؕ قُلْنَا يٰذَا الْقَرْنَيْنِ اِمَّاۤ اَنْ تُعَذِّبَ وَ اِمَّاۤ اَنْ تَتَّخِذَ فِيْهِمْ حُسْنًا ﴿۸۶﴾

یہاں تک کہ جب وہ (ادھر) پہنچا جدھر سورج ڈوبتا تھا اسے ایک سیاہ کیچڑ والے پانی میں غائب ہوتا ہوا پایا اور اس کے پاس ایک قوم کو (بھی) پایا۔ ہم نے کہا اے ذوالقرنین! چاہو تو سزا دو اور چاہو تو ان سے بھلائی کا معاملہ کرو۔ (1955)

﴿كُلِّ شَیْءٍ﴾ کیونکہ رستہ بھی کسی جگہ تک پہنچانے کا ذریعہ ہے۔ اور ہر چیز سے مراد اس کی ضرورت کی ہر شے ہے یعنی جس چیز کی اسے اپنی سلطنت کو مضبوط کرنے کے لیے ضرورت تھی اور ﴿مَكَّنَّاۤ لَهٗ﴾ کے لیے [دیکھو نمبر: 906]۔

1955- ﴿مَغْرِبَ الشَّمْسِ﴾ اس کے معنی کیے گئے ہیں [مُنْتَهِى الْاَرْضَ مِنْ جِهَةِ الْمَغْرِبِ] یعنی مغرب کی طرف اَلْاَرْضُ کا انتہائی مقام۔ مگر اَلْاَرْضِ سے مراد یہاں روئے زمین لینا غلطی ہے۔ اس سے مراد اس کا اپنا ملک ہے اور خاص ملک کے معنی میں یہ لفظ کثرت سے آتا ہے۔ خود قرآن شریف میں بھی کئی جگہ ہے جیسے ﴿اَنَّ الْاَرْضَ يَرِثُهَا عِبَادِىَ الصّٰلِحُوْنَ﴾ [الأنبیآء: 105:21] ''زمین کے وارث میرے صالح بندے ہوں گے۔'' اور ﴿مَغْرِبَ الشَّمْسِ﴾ سے مراد اس کے ملک کی مغربی حد ہے نہ کچھ اور۔ وہیں تک وہ جا بھی سکتا تھا۔

﴿عَيْنٍ حَمِئَةٍ﴾ عَيْنٍ پانی کی افراط ہے یا وہ جگہ جہاں پانی جمع ہوتا رہتا ہے۔ (ت) اور حَمِئَةٍ سیاہ کیچڑ ہے [دیکھو نمبر: 1685] اور ﴿عَيْنٍ حَمِئَةٍ﴾ یا سیاہ کیچڑ والا پانی بحیرہ اسود ہے جس کا نام بسبب اس کے پانی کی سیاہی کے اسود ہے اور اس کی سیاہی کی وجہ اس کی مٹی کا سیاہ ہونا ہے۔ اور یہ بھی ثابت ہے کہ دارائے اول کی حکومت مغرب میں بحیرہ اسود تک پہنچی ہوئی تھی۔

ذوالقرنین کا سفر مغرب:

سب سے پہلے قرآن کریم نے دارا کے مغربی سفر کا ذکر کیا ہے جو بحیرہ اسود پر جا کر ختم ہو گیا۔ اس کے بعد سفر مشرق کا ذکر آتا ہے اور اس کے بعد شمال کے سفر کا جو کوہ قاف کی طرف تھا۔ قرآن کریم نے یہاں یہ نہیں فرمایا کہ واقعی سورج سیاہ پانی میں غروب ہوتا تھا بلکہ ذوالقرنین نے ایسا پایا کیونکہ جب وہ خشکی کی سرحد پر پہنچ گیا تو آگے پانی ہی پانی تھا اور اسی میں اسے سورج ڈوبتا ہوا معلوم ہوا۔ جس طرح آگے آتا ہے ﴿وَجَدَهَا تَطْلُعُ عَلٰى قَوْمٍ﴾ اسے ایک قوم پر چڑھتے ہوئے پایا۔ یہ مراد نہیں کہ واقعی اس قوم میں سے سورج طلوع ہوتا تھا۔ اسی طرح یہاں یہ مراد نہیں کہ واقعی سورج سیاہ پانی میں ڈوبتا تھا۔ اور غَرب یا مَغرِب کے معنی ڈوبنا نہیں بلکہ غائب ہو جانا یعنی نظر سے اوجھل ہو جانا اور دور نکل جانا ہیں [دیکھو نمبر: 816]۔ پس یہ خیال سرے سے ہی غلط ہے کہ پانی میں سورج ڈوب جاتا تھا۔

قَالَ اَمَّا مَنۡ ظَلَمَ فَسَوۡفَ نُعَذِّبُهٗ ثُمَّ يُرَدُّ اِلٰى رَبِّهٖ فَيُعَذِّبُهٗ عَذَابًا نُّكۡرًا ﴿۸۷﴾

اس نے کہا جو ظلم کرے ہم اسے سزا دیں گے۔ پھر وہ اپنے رب کی طرف لوٹایا جائے گا تو وہ اسے بہت بڑا عذاب دے گا۔

وَ اَمَّا مَنۡ اٰمَنَ وَ عَمِلَ صَالِحًا فَلَهٗ جَزَآءَ ۨ الۡحُسۡنٰى ۚ وَ سَنَقُوۡلُ لَهٗ مِنۡ اَمۡرِنَا يُسۡرًا ﴿۸۸﴾

اور جو کوئی ایمان لاتا ہے اور اچھے عمل کرتا ہے تو اس کے لیے بہت اچھا بدلہ ہے اور ہم اسے اپنے معاملہ میں سہل بات کہیں گے۔ (1956)

نبوت ذوالقرنین:

آیت کے پچھلے حصہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ذوالقرنین نبی بھی تھے۔ کیونکہ ایک تو یہاں اللہ تعالیٰ کا ان سے خطاب ہے جس میں عذاب وثواب کا اختیار دیا گیا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ انہیں وحی بھی ہوتی تھی اور یہ ان کی نبوت پر ایک دلیل ہے۔ دوسرے ایک قوم کے ان سے مقابلہ کا ذکر ہے اور اپنی مخالفت پر وہ کہتے ہیں کہ جو شخص ظلم کرے گا اسے یہاں بھی سزا ملے گی اور آخرت میں بھی اسے عذاب ملے گا۔ اور یہ بات صرف ایک نبی ہی کہہ سکتا ہے۔ اور یہ جو اختیار دیا ہے کہ چاہو تو سزا دو اور چاہو تو اچھا معاملہ کرو۔ تو مراد یہ ہے کہ اس قوم میں سے جس سے چاہو وہ سلوک کرو، جس سے چاہو یہ۔ اس کی وجہ اگلی آیت میں مذکور ہے اور حُسۡنًا سے مراد [اَمۡرًا ذَا حُسۡنٍ] یعنی خوبی کا معاملہ ہے۔ اور یہاں مراد ان سے احسان کر کے ان کو معاف کر دینا ہے۔

1956 - **مکذبین اور مومنین ذوالقرنین کا انجام:** یہاں ایسے ہی دو گروہوں کا ذکر ہے جو انبیاء کے معاملہ میں ہو جاتے ہیں۔ یعنی ایک گروہ تو وہ جو ایمان لاتا اور عمل صالح کرتا ہے اور دوسرا گروہ محض منکروں کا نہیں ہوتا بلکہ وہ لوگ ہوتے ہیں جو حق کی مخالفت کرتے اور اہل حق پر ظلم کرتے ہیں جس کو یہاں ﴿مَنۡ ظَلَمَ﴾ کہا ہے اور اس سے مراد محض ارتکاب شرک نہیں۔ بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ کوئی ایسی قوم تھی جس کی طرف سے پہلے کسی قسم کی زیادتی ہو چکی تھی۔ اس لیے اللہ تعالیٰ کے ارشاد میں بھی پہلے ﴿اِمَّاۤ اَنۡ تُعَذِّبَ﴾ ہی رکھا ہے اور ذوالقرنین نے بھی پہلے سزا کا اور ظالموں کا ہی ذکر کیا ہے اور یہ مہم اس قوم کی سزا کے لیے تھی۔ لیکن چونکہ انبیاء صرف سزا کے لیے نہیں ہوتے اس لیے پھر بھی اس قوم کو موقعہ دیا ہے کہ جو ان میں سے ایمان لائے ان پر کوئی سختی نہ کی جائے گی ﴿سَنَقُوۡلُ لَهٗ مِنۡ اَمۡرِنَا يُسۡرًا﴾ لیکن جو پھر بھی ظلم اور مخالفت کو نہیں چھوڑتا تو اس کو اس دنیا میں بھی سزا دی جائے گی۔ مفسرین نے ﴿فَسَوۡفَ نُعَذِّبُهٗ﴾ میں صرف سزائے قتل کو لیا ہے۔ حالانکہ قرآن شریف نے قتل کا ذکر نہیں کیا۔ اس لیے مراد کوئی سزا ہے جو ان لوگوں کے لائق حال ہو۔ اور يُسۡرًا سے مراد [ذَا يُسۡرٍ] یعنی سہولت کی بات ہے۔ اور جن لوگوں نے [آیت:86] میں حسن کے معاملہ سے مراد قید کرنا لیا ہے گویا وہ قتل کے مقابل پر اچھا معاملہ ہے۔ تو نہ صرف وہ الفاظ

ثُمَّ اَتْبَعَ سَبَبًا ﴿۸۹﴾ پھر وہ ایک (اور) راہ پر چلا۔

حَتّٰٓى اِذَا بَلَغَ مَطْلِعَ الشَّمْسِ وَجَدَهَا تَطْلُعُ عَلٰى قَوْمٍ لَّمْ نَجْعَلْ لَّهُمْ مِّنْ دُوْنِهَا سِتْرًا ﴿۹۰﴾ یہاں تک کہ وہ جب وہ (ادھر) پہنچا جدھر سورج نکلتا تھا تو اسے ایک ایسی قوم پر نکلتے ہوئے پایا جن کے لیے ہم نے اس سے بچنے کے لیے کوئی اوٹ نہیں بنائی تھی۔ (1957)

كَذٰلِكَ ۭ وَقَدْ اَحَطْنَا بِمَا لَدَيْهِ خُبْرًا ﴿۹۱﴾ ایسا ہی تھا اور جو اس کے پاس تھا ہمیں اس کا پورا علم تھا۔ (1958)

ثُمَّ اَتْبَعَ سَبَبًا ﴿۹۲﴾ پھر ایک (اور) راہ پر چلا۔

حَتّٰٓى اِذَا بَلَغَ بَيْنَ السَّدَّيْنِ وَجَدَ یہاں تک کہ جب وہ دو پہاڑوں کے درمیان پہنچا

ہی ان کے اس خیال کو باطل کرتے ہیں کیونکہ احسان کا تقاضا معافی ہے بلکہ یہاں ﴿جَزَآءَ ِۨالْحُسْنٰى﴾ کے لفظ بھی اس کی تردید کرتے ہیں۔ جو لوگ قید ہونے کے قابل ہوں ان کو آخرت میں جزاء حسنیٰ ملنا بے معنی ہے۔

1957- ﴿مَطْلِعَ الشَّمْسِ﴾ طَلَعَ کے لیے [دیکھو نمبر: 990] ﴿مَطْلِعَ الشَّمْسِ﴾ کے معنی کیے ہیں [غَايَةُ الْأَرْضِ الْمَعْمُوْرَةِ مِنْ جِهَةِ الْمَشْرِقِ] (روح المعانی، جلد 16، صفحہ 35) (ر) یعنی مشرق کی جانب آخری آبادی۔ مگر یہاں بھی آخری آبادی سے مراد اس کی اپنی مملکت کی آخری آبادی ہے نہ روئے زمین کی آخری آبادی۔

سِتْرًا۔ سِتْرٌ کے معنی کسی چیز کا ڈھانک دینا ہیں اور یہاں سِتْرٌ نہ ہونے سے مراد عمارتوں کا نہ ہونا ہے۔ جیسا کہ ایک حدیث میں ہے [لَمْ يُبْنَ فِيهَا بِنَاءٌ قَطُّ] (اتحاف الخيرة المهرة، جلد 6، صفحہ 170) (ر)

مشرقی حدود کا سفر:

یہ ذوالقرنین کا شرقی سفر ہے جو حدود کی مضبوطی کے لیے کیا اور اس طرف اس کی مملکت کی انتہا اس قوم پر بتائی ہے جو عمارتیں بنا کر نہ رہتے تھے یعنی خانہ بدوش اقوام تھیں۔

1958- **اس کے لشکر اور سامان:** یعنی جو کچھ لشکر یا سامان حرب وغیرہ اس کے پاس تھا اس کا ہمیں علم تھا۔ مطلب یہ کہ ان مہمات کے لیے اس کے پاس ہر قسم کا کافی سامان تھا۔

مِنْ دُوْنِهِمَا قَوْمًا ۙ لَّا يَكَادُوْنَ يَفْقَهُوْنَ قَوْلًا ﴿۹۳﴾

تو ان سے ورے ایک قوم کو پایا جو قریب نہ تھا کہ بات سمجھیں۔(1959)

قَالُوْا يٰذَا الْقَرْنَيْنِ اِنَّ يَاْجُوْجَ وَ مَاْجُوْجَ مُفْسِدُوْنَ فِي الْاَرْضِ فَهَلْ نَجْعَلُ لَكَ

انہوں نے کہا اے ذوالقرنین! یاجوج اور ماجوج(1960) اس ملک میں فساد کرنے والے ہیں تو کیا

1959- سَدَّ۔ سَدَّيْنِ۔ سَدّ کے لیے [دیکھو نمبر: 614]۔ ہر ایک مانع سَدّ ہے۔ (غ) ﴿وَ جَعَلْنَا مِنْۢ بَيْنِ اَيْدِيْهِمْ سَدًّا وَّ مِنْ خَلْفِهِمْ سَدًّا﴾ [یٰسٓ: 9:36] ''اور ہم نے ان کے سامنے ایک دیوار بنادی ہے اور ایک دیوار ان کے پیچھے بھی۔'' اور دیوار کو اور پہاڑ کو بھی سد کہتے ہیں۔ (ل)

سدین سے مراد:

اور یہاں سَدَّيْنِ سے مراد جیسا کہ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے آرمینیا اور آذربائیجان کے دو پہاڑ ہیں۔

﴿لَّا يَكَادُوْنَ يَفْقَهُوْنَ قَوْلًا﴾ سے مراد ہے کہ وہ زبان نہ سمجھتے تھے یعنی ان کی زبان اور تھی۔ یہ ذوالقرنین کا شمالی سفر ہے اور سب سے زیادہ خطرہ اسی طرف سے تھا۔ انسائیکلو پیڈیا بری ٹینیکا میں ہے کہ ''میڈیا کے شمال میں جو اقوام تھیں وہ ایرانی یا انڈو یورپین نہ تھیں بلکہ آرمینیا کے پہلے باشندوں کی طرح وہاں کی اصلی قومیں تھیں جو شاید کوہ قاف کی بے شمار قوموں میں سے تھیں۔''

1960- **یاجوج ماجوج کی وجہ تسمیہ:** ﴿يَاْجُوْجَ وَ مَاْجُوْجَ﴾ ۔ اَجِيج سے یفعُول اور مَفعُول کے وزن ہیں اور اجیج آگ کے شعلہ مارنے یا بھڑکنے کو کہتے ہیں اور اَجّ کے معنی اَسرَع بھی ہیں یعنی تیز چلا۔ اور یہ اللہ تعالیٰ کی پیدائش میں سے دو قبیلے ہیں۔

اُجَاجٌ اور [مَاءٌ اُجَاجٌ] کھارے پانی کو کہتے ہیں یا اس کا جس کا کھارا پن بہت سخت ہو۔ (ل) ﴿هٰذَا مِلْحٌ اُجَاجٌ﴾ [فاطر: 12:35] ''یہ کھاڑی ہے کڑوا۔'' اور یاجوج اور ماجوج کو ان کے کثرت اضطراب کی وجہ سے شعلے مارنے والی آگ سے اور موجیں مارنے والے پانیوں سے تشبیہ دی گئی ہے۔ (غ) اور اَجّ سے مشتق ہونے میں شاید یہ اشارہ ہو کہ یہ قومیں آگ سے بہت کام لیں گی اور یاجوج ماجوج آدم کی نسل سے ہیں جیسا کہ صحیحین سے ثابت ہے۔ (ث) اور بعض کے نزدیک وہ یافث بن نوح کی اولاد سے دو قبیلے ہیں اور ترک بھی انہیں میں سے ہیں جو دیوار سے ادھر چھوڑا جانے کی وجہ سے ترک کہلائے۔

حدیث و آثار کی شہادت کہ یاجوج ماجوج ہماری طرح آدمی ہیں:

اور کعب احبار سے روایت ہے کہ یاجوج ماجوج آدم کی اولاد میں سے ہیں مگر حوا سے نہیں۔ (ر) پس یاجوج ماجوج نسل انسانی میں سے ہیں۔ اور ان کے متعلق جو بعض الفاظ احادیث میں آتے ہیں جن سے بعض کو یہ خیال گزرتا ہے کہ وہ ہماری طرح کے

آدمی نہیں تو لازماً وہ استعارہ کے رنگ کے ہیں اور اس بارہ میں سب روایات قابل قبول بھی نہیں۔ مثلاً یہ قول جو سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما کی طرف منسوب ہے کہ ان کے قد ایک بالشت اور دو بالشت یا زیادہ سے زیادہ تین بالشت ہیں۔ یا یہ کہ ان میں سے ایک مرتا ہے تو ایک ہزار ذریت چھوٹا ہے جس کو مرفوع بھی بتایا جاتا ہے مگر منکر قرار دیا گیا ہے۔

یاجوج ماجوج کی اصلیت پر انسائیکلو پیڈیا:

یہودی انسائیکلو پیڈیا میں ہے جوزیفس ان کو وہی قوم بتاتا ہے جو سیتھین کہلاتی ہے اور جیرومی کہتا ہے کہ میگاگ (ماجوج) کوہ قاف سے پرے بحیرہ خضر کے قریب تھا۔ انسائیکلو پیڈیا بری ٹینیکا بھی اسی رائے کا مؤید ہے یعنی انہیں سیتھین قومیں قرار دیتا ہے اور کہتا ہے کہ شمال کی بہت سے اقوام میں سے کسی ایک یا سب پر اس لفظ کا استعمال ہوسکتا ہے۔

بائبل کی شہادت کہ یاجوج ماجوج اقوام یورپ ہیں:

بائبل میں ہے:

''خداوند کا کلام مجھ کو پہنچا اور اس نے کہا کہ اے آدم زاد تو جوج کے مقابل جو ماجوج کی سرزمین کا ہے اور روش اور مسک اور توبال کا سردار ہے اپنا منہ کر اور اس کے برخلاف نبوت کر اور کہہ کہ خداوند یہوداہ یوں کہتا ہے کہ دیکھ اے جوج روش اور مسک اور توبال کے سردار میں تیرا مخالف ہوں اور میں تجھے پھرادوں گا اور تیرے جبڑوں میں بنسیاں ماروں گا۔''[حزقیل ایل: 38:1-4]

یہاں تین نام یاجوج ماجوج کے ذکر میں آئے ہیں۔ روش، مسک اور توبال۔ مفسرین بائبل ایسے صریح الفاظ سے گھبرا کر ان ناموں کو ایشیائے کوچک میں تلاش کرتے پھرتے ہیں اور کہتے ہیں روش سے مراد روس نہیں۔ کیوں اس لیے کہ اس صورت میں پیشگوئی اپنے ہی گھر کے خلاف ثابت ہوتی ہے۔ مگر واقعات ایسے زبردست ہیں کہ ان کے سامنے یہ انکار قائم نہیں رہ سکتا۔ یاجوج ماجوج کا کوہ قاف کے شمال میں ہونا ایک مسلم امر ہے۔ جسے یہودی انسائیکلو پیڈیا اور انسائیکلو پیڈیا بری ٹینیکا دونوں میں صحیح تسلیم کیا گیا ہے۔ اب ایشیائے کوچک میں ان ناموں کو تلاش کرنا عبث کوشش ہے۔ کوہ قاف کے شمال میں روس بھی ہے اور مسک اور توبال بھی موجود ہیں۔ مؤخرالذکر دونوں ناموں کے دو دریا (مسکوا اور توبال) کوہ قاف کے شمال میں ملک روس میں بہہ رہے ہیں اور ان میں سے اول پر ماسکو کا قدیم شہر آباد ہے اور مؤخرالذکر پر توبالسک۔ اور یہ یقینی امر ہے کہ جوج یا یاجوج جس کا یہاں ذکر ہے اس سے مراد روس ہی ہے نہ کچھ اور۔ پس یاجوج ماجوج میں سے ایک روس ہے یا سلانی قوموں کا مسکن۔ آیا ماجوج ٹیوٹن قوم کا مسکن ہے یا نہیں۔ گو اس کی تائید میں کوئی دلائل پیش نہیں کرسکتا مگر اقوام یورپ کے ایک حصہ پر اس صراحت سے یاجوج کا نام صادق آنا خود بائبل اور انسائیکلو پیڈیا سے ثابت ہے، کوئی شک باقی نہیں رہنے دیتا کہ ماجوج سے مراد بھی انہی قوموں کا کوئی دوسرا بڑا عظیم الشان حصہ ہے۔ اور لندن کے گلڈ ہال کے سامنے یاجوج اور ماجوج کے بتوں کا نصب ہونا جن کی اصلیت بھی بہت پرانے زمانے کی بتائی جاتی ہے یعنی اس قسم کے بت ہنری خامس کے زمانہ میں بھی موجود تھے۔ بتاتا ہے کہ جس نتیجہ پر ہم پہنچے ہیں وہی درست ہے اور ممکن ہے کہ ابتدا میں ان قوموں کے باہم تعلقات بھی ہوں یا یہ

خَرْجًا عَلٰٓى اَنْ تَجْعَلَ بَيْنَنَا وَ بَيْنَهُمْ سَدًّا ﴿۹۴﴾

ہم تیرے لیے کچھ مہیا کر دیں تا کہ تو ہمارے اور ان کے درمیان ایک روک بنا دے۔ (1961)

ایک ہی قوم کی دو شاخیں ہوں۔

1961- خَرَجٌ۔ خَرَاجٌ۔ خَرْجٌ اور خَرَاجٌ وہ چیز ہے جو لوگ سال میں ایک دفعہ معلوم اندازہ سے اپنے مال سے نکالتے ہیں یا خراج جو لوگوں کے مال سے لیا جاتا ہے۔ (ل) ﴿اَمْ تَسْئَلُهُمْ خَرْجًا فَخَرَاجُ رَبِّكَ خَيْرٌ﴾ [المؤمنون: 72:23] ''کیا تو ان سے کچھ صلہ مانگتا ہے تو تیرے رب کا صلہ بہتر ہے۔'' اور خرج میں خراج کی نسبت وسعت ہے اور آمد کے مقابل یعنی خرچ کو بھی خرج کہا جاتا ہے۔ (غ)

یاجوج ماجوج کا دوبارہ فساد اور ترکوں پر حملہ:

یاجوج وماجوج کے فساد سے کیا مطلب ہے۔ ابن کثیر میں ہے [يَخْرُجُ مِنْهَا يَأْجُوْجَ وَمَأْجُوْجَ عَلٰى بِلَادِ التُّرْكِ، فَيَعِيْثُوْنَ فِيْهِمْ فَسَادًا، وَيُهْلِكُوْنَ الْحَرْثَ وَالنَّسْلَ.] (ابن کثیر، جلد5، صفحہ 195) یعنی اس جگہ سے یاجوج ماجوج ترکوں کے ملک پر حملہ آور ہوں گے اور وہاں فساد برپا کریں گے اور کھیتی اور نسل کو تباہ کر دیں گے۔ احادیث میں یاجوج ماجوج کے ایک خروج کا آخری زمانہ میں ذکر ہے جس کی طرف آگے [آیت: 99,98] میں اشارہ ہے۔ اور یہ دونوں خروج ترکوں پر حملہ سے ہی مخصوص معلوم ہوتے ہیں۔ خروج اول میں جو قوم ہے وہ بھی جیسا کہ اوپر ذکر ہوا ترک ہی معلوم ہوتے ہیں گو وہ ان میں سے ہوں یا نہ ہوں۔ لیکن اس میں کچھ شک معلوم نہیں ہوتا کہ دیوار جس کے بنانے کا یہاں ذکر ہے اس کے جنوب کی طرف جو قوم رہ گئی وہ ترک ہی تھے اور شمال کی طرف جو اقوام رہ گئیں وہ یاجوج ماجوج تھیں۔ اور ایسا ہی مقدر تھا کہ بار اول بھی یہ شمالی اقوام ترکوں پر ہی حملہ آور ہوں اور آخری زمانہ میں بھی ترک ہی ان کے حملہ کا خاص نشانہ ہوں۔ اور یہ جو یہاں یاجوج ماجوج کے فساد کا ذکر ہے تاریخ بھی اس پر شاہد ہے۔ وہ قومیں جو آرمینیا اور آذر بائیجان کے پہاڑوں کے درمیان رہتی تھیں وہ اپنے شمالی ہمسائیوں یعنی یاجوج ماجوج سے ہمیشہ تکلیف اٹھاتی تھیں اور ان کے ان پر حملے ہوتے رہتے تھے۔ چنانچہ انسائیکلو پیڈیا بری ٹینیکا میں ہے کہ وہی سیتھین قومیں جنہیں ماجوج قرار دیا گیا ہے ماوہ پر 28 سال کے لیے حکمران رہیں اور 512 قبل مسیح کے قریب دارا نے ان پر فوج کشی کی۔ اور کہ اس جنگ کی غرض صرف یہی تھی کہ تورانی قوموں پر عقب کی طرف سے حملہ آور ہو کر سلطنت کی شمالی سرحد پر امن قائم کیا جائے۔ اس سے قرآن کریم کے اس بیان کی تائید ہوتی ہے جو ذوالقرنین کے سفر شمال کے متعلق ہے اور نیز اس کی کہ کوہ قاف سے شمال کی طرف رہنے والی قوموں کی طرف سے ایران کی شمالی سرحد کی قوموں پر حملے ہوتے رہتے تھے۔

قَالَ مَا مَكَّنِّيْ فِيْهِ رَبِّيْ خَيْرٌ فَاَعِيْنُوْنِيْ بِقُوَّةٍ اَجْعَلْ بَيْنَكُمْ وَ بَيْنَهُمْ رَدْمًا ﴿۹۵﴾

اس نے کہا جو میرے رب نے مجھے طاقت دی ہے وہ بہتر ہے سو تم مجھے (اپنی) قوت سے مدد دو۔ میں تمہارے اور ان کے درمیان ایک دیوار بنا دوں گا۔ (1962)

اٰتُوْنِيْ زُبَرَ الْحَدِيْدِ ؕ حَتّٰۤى اِذَا سَاوٰى بَيْنَ الصَّدَفَيْنِ قَالَ انْفُخُوْا ؕ حَتّٰۤى اِذَا جَعَلَهٗ

میرے پاس لوہے کے (بڑے بڑے) ٹکڑے لے آؤ۔ پھر جب اس نے پہاڑوں کی دونوں طرفوں کے درمیان (دیوار کو) برابر کر دیا کہا دھونکو، یہاں تک کہ جب اسے

1962 - رَدْم۔ کسی رخنہ یا پتھروں سے روکنا ہے۔ (غ) اور یہ سَدّ سے بڑھ کر ہے کیونکہ اس میں ایک چیز دوسری کے اوپر رکھی جاتی ہے۔ (ل)

﴿اَعِيْنُوْنِيْ بِقُوَّةٍ﴾۔ مراد یہ ہے کہ روپے کی مجھے ضرورت نہیں البتہ مزدوری وغیرہ کا تم انتظام کر دو۔

ذوالقرنین کی دیوار:

یہ دیوار جس کا یہاں ذکر ہے وہ مشہور دیوار ہے جو در بند پر بحیرہ خضر کے کنارے واقع ہے بنی ہوئی ہے۔ مسلمان جغرافیہ نویسوں نے بھی اس دیوار کا ذکر کیا ہے۔ چنانچہ مراصد الاطلاع میں بھی یہ ذکر ہے اور ابن الفقیہ نے بھی اس کا ذکر کیا ہے۔ انسائیکلو پیڈیا بری ٹینیکا میں اس دیوار کا حسب ذیل ذکر ہے۔ ''در بند ایران کا ایک شہر ہے جو علاقہ قاف میں داغستان کے صوبہ میں ہے اور بحیرہ خضر کے مغربی کنارہ پر ہے۔۔۔ یہ سمندر کے ساتھ ہی ایک تنگ قطعہ زمین پر واقع ہے جہاں سے یہ ڈھلوان بلندیوں پر خشکی کے اندر کو اونچا چلا گیا ہے۔۔۔ اور جنوب کی طرف دیوار قاف کا سمندر کی طرف کا سرا واقع ہے جو پچاس میل لمبی ہے اور جسے سد سکندر کہتے ہیں جس کی وجہ سے باب حدید یا باب خضر کا تنگ درہ رک گیا ہے۔ یہ دیوار جب سالم تھی تو 29 فٹ اونچی تھی اور موٹائی میں تقریباً دس فٹ تھی اور اپنے لوہے کے دروازوں اور بے شمار حفاظت کے برجوں کے ساتھ سرحد ایران کا نہایت قیمتی استحکام تھی۔'' اس دیوار کا شمالی سرحد پر ایران کی حفاظت کا ذریعہ ہونا جیسے یہاں تسلیم کیا گیا ہے بالکل قرآن شریف کے بیان کے مطابق ہے۔ اور اسے جو سد سکندر کہا جاتا ہے تو اس کی وجہ مسلمان تاریخ نویسوں کی یہ غلطی معلوم ہوتی ہے کہ وہ ذوالقرنین سے مراد سکندر لیتے ہیں (یاد رکھنا چاہیے کہ ذوالقرنین دارائے اول ہے وہ دارا نہیں جس کا مقابلہ سکندر سے ہوا تھا) یہ بیان کچھ شبہ باقی نہیں رہنے دیتا کہ جس دیوار کا ذکر قرآن شریف میں ہے یہی در بند کی دیوار ہے جو قاف کی شمالی قوموں کو ایران پر حملہ آور ہونے سے روکنے کے لیے بنائی گئی تھی۔ جنہیں نہ صرف قرآن شریف یاجوج ماجوج قرار دیتا ہے بلکہ خود مورخین بھی انہی کو یاجوج ماجوج قرار دیتے ہیں۔

نَارًا ۙ قَالَ اٰتُوْنِيْٓ اُفْرِغْ عَلَيْهِ قِطْرًا ﴿۹۶﴾

آگ (کی طرح) کر دیا کہا مجھے پگھلا ہوا تانبا لا دو تا کہ اس کے اوپر ڈالوں۔ (1963)

فَمَا اسْطَاعُوْٓا اَنْ يَّظْهَرُوْهُ وَ مَا اسْتَطَاعُوْا لَهٗ نَقْبًا ﴿۹۷﴾

سو نہ تو وہ اس قابل تھے کہ اس پر چڑھ سکیں اور نہ اس میں سوراخ کر سکتے تھے۔ (1964)

قَالَ هٰذَا رَحْمَةٌ مِّنْ رَّبِّيْ ۚ فَاِذَا جَآءَ

کہا یہ میرے رب کی رحمت ہے۔ پس جب میرے رب کا

1963 - صَدَفَ۔ صَدَفَيْنِ۔ صدف کا تثنیہ ہے اور صَدَفٌ پہاڑ کی جانب کو کہتے ہیں اور [صَدَفَ عَنْهُ] کے معنی ہیں اس سے سخت اعراض کیا ﴿وَصَدَفَ عَنْهَا﴾ [الأنعام: 157:6] ''اور ان سے پھر جائے۔''

قِطَرَ۔ قِطر۔ قُطر جانب کو کہتے ہیں جمع اقطار ہے ﴿اَنْ تَنْفُذُوْا مِنْ اَقْطَارِ السَّمٰوٰتِ﴾ [الرحمٰن: 33:55] ''آسمانوں اور زمین کے کناروں سے نکل جاؤ۔'' ﴿وَ لَوْ دُخِلَتْ عَلَيْهِمْ مِّنْ اَقْطَارِهَا﴾ [الأحزاب: 14:33] ''اور اگر (دشمن) ان پر اس کی اطراف سے داخل ہوتا۔'' اور قِطْرَ پگھلائے ہوئے تانبے کو کہتے ہیں اور قَطِرَانِ رال کو کہتے ہیں ﴿سَرَابِيْلُهُمْ مِّنْ قَطِرَانٍ﴾ [إبراهيم: 50:14] ''ان کے کرتے رال کے ہوں گے۔'' قِطار بھی اسی سے ہے۔ (غ)

پتھر کی دیوار میں لوہے کے دروازے:

یہ دیوار لوہے کی بنی ہوئی نہ تھی بلکہ پتھروں کی تھی جس پر خود لفظ رَدْم شاہد ہے، [دیکھو نمبر: 1962]۔ پھر لوہے کے ٹکڑے کس لیے منگوائے؟ یہی باتیں ہیں جو قرآن کریم کے کمال علمی پر دلالت کرتی ہیں۔ رسول اللہ ﷺ تو اس دیوار کو دیکھنے نہ گئے تھے اور مسلمان آج تک اس کی تعیین نہ کر سکے۔ یہاں تک کہ ہمارے اس زمانہ میں سرسید نے دیوار چین کو یہ دیوار قرار دیا ہے۔ مگر اب اس کی صحیح طور پر تعیین ہو جانے پر کس قدر تعجب اس بات پر ہوتا ہے کہ فی الواقع دیوار تو پتھروں کی بنی ہوئی ہے۔ جیسے قرآن کریم نے رَدْمَ کہہ کر بتا دیا۔ مگر اس میں دروازے لوہے کے تھے اور انہی کے لیے لوہے کے ٹکڑے منگوائے گئے تھے۔ اس لیے لوہے کے استعمال کا ذکر اس وقت آتا ہے جب دیوار بن چکی اور پہاڑوں کی دونوں جانبوں میں برابر ہو چکی تو پھر لوہے کو گرم کیا گیا اور اس پر پگھلا ہوا تانبا ڈالا گیا تا کہ اس کی مزید مضبوطی کا موجب ہو۔ پگھلا ہوا تانبا دیوار پر نہیں ڈالا گیا بلکہ لوہے کے تختوں پر جن کے پھاٹک بنے۔

1964 - یعنی یہ دیوار ان شمالی قوموں کے لیے روک ہو گئی۔ نہ وہ اس کے اوپر چڑھ سکتے تھے نہ نقب لگا سکتے تھے۔ اس لیے کہ جا بجا اس میں برج تھے جن میں فوج رہتی تھی۔

وَعْدُ رَبِّيْ جَعَلَهٗ دَكَّآءَ ۚ وَ كَانَ وَعْدُ رَبِّيْ حَقًّا ﴿۹۸﴾

وعدہ آ جائے گا تو اسے ہموار (زمین) کر دے گا اور میرے رب کا وعدہ سچا ہے۔ (1965)

وَ تَرَكْنَا بَعْضَهُمْ يَوْمَئِذٍ يَّمُوْجُ فِيْ بَعْضٍ وَّ نُفِخَ فِي الصُّوْرِ فَجَمَعْنٰهُمْ جَمْعًا ﴿۹۹﴾

اور ہم انہیں اس دن ایک دوسرے پر موجیں مارتے ہوئے چھوڑ دیں گے اور صور پھونکا جائے گا۔ پس ہم ان کو اکٹھا کر دیں گے۔ (1966)

1965- دَكَّ۔ دَكَّاءَ۔ دَكَّآءَ ۔ دَكّ پہاڑ یا اور کسی ایسی چیز کے گرانے کو کہتے ہیں۔(ل) ﴿فَلَمَّا تَجَلّٰى رَبُّهٗ لِلْجَبَلِ جَعَلَهٗ دَكًّا﴾ [الأعراف: 143:7] ''پس جب اس کے رب نے پہاڑ پر تجلی فرمائی اس کو ریزہ ریزہ کر دیا۔'' ﴿وَّ حُمِلَتِ الْاَرْضُ وَ الْجِبَالُ فَدُكَّتَا دَكَّةً وَّاحِدَةً ۙ﴾ [الحاقة: 14:69] ''اور زمین اور پہاڑ اٹھائے جائیں گے پھر ایک ہی مرتبہ ریزہ ریزہ کر دیئے جائیں گے۔'' اور ایک قول یہ بھی ہے کہ دَكّ سے مراد زلزلہ ہے۔(ل) اور دَكَّاءٌ مٹی کے پشتہ کو کہتے ہیں جو بہت بڑا نہ ہو۔ (ل) [اَرضٌ دَكّاء] ہموار زمین ہے۔(غ) اور یہاں ﴿جَعَلَهٗ دَكًّا﴾ سے مراد [اَرْضًا دَكَّاءَ] ہی ہے۔

دیوار کی تباہی:

مطلب یہ ہے کہ یہ روک آخر کار تباہ ہو جائے گی اور پھر یاجوج ماجوج کا خروج ہوگا۔ مگر یہ ضروری نہیں کہ وہ خروج اسی دیوار کی جگہ سے ہو، نہ یہ ضروری ہے کہ وہی قوم نکلے بلکہ اسی قوم کی نسل یا اسی قسم کی اور قومیں مراد ہو سکتی ہیں۔ اور ایک حدیث میں جو یہ لفظ آتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ آپ کی بعثت کے وقت اس دیوار میں ایک چھوٹا سا سوراخ کر لیا گیا ہے۔ تو اس کا مطلب بھی یہی ہے کہ ان قوموں کے خروج اور دنیا پر غالب آنے کا وقت قریب آ گیا ہے۔

1966- مَوْجٌ۔ يَمُوْجُ۔ مَوْجٍ سمندر کی لہر کو کہتے ہیں ﴿فِيْ مَوْجٍ كَالْجِبَالِ﴾ [هود: 42:11] ''پہاڑ جیسی لہروں میں۔'' اور ماج (یموج) کے معنی ہیں اس میں لہر کی طرح اضطراب آیا۔(غ)

یاجوج و ماجوج کا آخری خروج اور ان کا انجام:

یہ انہی اقوام کی حالت ہے جن کے خروج کی طرف آیت ماقبل میں اشارہ ہے۔ خود قرآن کریم میں دوسری جگہ صاف الفاظ میں ہے ﴿حَتّٰۤى اِذَا فُتِحَتْ يَاْجُوْجُ وَ مَاْجُوْجُ وَ هُمْ مِّنْ كُلِّ حَدَبٍ يَّنْسِلُوْنَ ﴿۹۶﴾﴾ [الأنبيآء: 96:21] یعنی جب یاجوج ماجوج کا خروج ہوگا تو وہ ہر ایک بلندی سے نکل پڑیں گے۔ جس سے مراد یہ ہے کہ کل دنیا پر غالب ہو جائیں گے۔ چنانچہ حدیث مسلم جہاں خروج یاجوج ماجوج کا ذکر ہے وہاں صاف الفاظ ہیں [لَا يَدَانِ لأَحَدٍ بِقِتَالِهِمْ] (صحيح مسلم، كتاب الفتن وأشراط الساعة، باب ذِكْرِ الدَّجَّالِ وَصِفَتِهِ وَمَا مَعَهُ، حديث: 7560) ان کے ساتھ جنگ کرنے کی کسی کو

وَّ عَرَضۡنَا جَهَنَّمَ يَوۡمَئِذٍ لِّلۡكٰفِرِيۡنَ عَرۡضَا ۙ﴿۱۰۰﴾

اور اس دن ہم دوزخ کو کافروں کے سامنے لے آئیں گے۔

الَّذِيۡنَ كَانَتۡ اَعۡيُنُهُمۡ فِىۡ غِطَآءٍ عَنۡ ذِكۡرِىۡ وَ كَانُوۡا لَا يَسۡتَطِيۡعُوۡنَ سَمۡعًا ﴿۱۰۱﴾ ع 11 19 2

وہ جن کی آنکھیں میرے ذکر سے پردے میں تھیں اور وہ سن بھی نہ سکتے تھے۔

اَفَحَسِبَ الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡۤا اَنۡ يَّتَّخِذُوۡا عِبَادِىۡ مِنۡ دُوۡنِىۡۤ اَوۡلِيَآءَ ؕ اِنَّاۤ اَعۡتَدۡنَا جَهَنَّمَ لِلۡكٰفِرِيۡنَ نُزُلًا ﴿۱۰۲﴾

تو کیا جو کافر ہیں وہ سمجھتے ہیں کہ میرے مقابل میں میرے بندوں کو کارساز بنائیں، ہم نے دوزخ کو کافروں کے لیے مہمانی (کے طور پر) تیار کیا ہے۔ (1967)

طاقت نہ ہوگی۔ قرآن وحدیث کی یہ متفقہ شہادت ایک ذرہ بھر بھی شبہ باقی نہیں چھوڑتی کہ یاجوج وماجوج کون سی قومیں ہیں اوران کا خروج ہو چکا ہے۔ وہ یہی یورپین اقوام ہیں، سلانی ہوں یا ٹیوٹن۔ جنہوں نے دنیا پر ایسا غلبہ حاصل کیا ہے کہ کوئی بلندی ان کے تصرف سے باہر نہیں رہ گئی۔ اور یہ دنیا کی تاریخ میں ایک بے نظیر امر ہے اور اس آیت میں ان کی اپنی حالت کا ذکر ہے کہ ہم انہیں ایسی حالت میں چھوڑ دیں گے کہ وہ ایک دوسرے پر موجیں مارتے ہوں گے یعنی ساری دنیا پر غالب آ کر پھر آپس میں لگ جائیں گے خواہ وہ جنگ کے ذریعے سے ہو جیسا کہ گزشتہ یورپ میں ہوا یا اور کسی ذریعہ سے۔ اور لفظ یَمُوۡجُ میں ان کے اضطراب اور حیرت کا ذکر ہے کہ باوجود ساری دنیا کو مسخر کر لینے کے انہیں کوئی اطمینان قلب میسر نہیں ہوگا۔ یہ تموج بہرحال شروع تو ہو چکا ہے آئندہ کس کس رنگ میں اس کا ظہور ہوگا یہ علم اللہ تعالیٰ کو ہی ہے۔ اور ایسا ہی بگل بجانے پر ان کا جمع ہونا صرف قیامت کبریٰ تک محدود نہیں بلکہ یہاں ان کی قومی قیامت کا ذکر معلوم ہوتا ہے اور کم از کم شامل ضرور ہے۔ اور ان کے جمع ہونے میں اشارہ شاید دین حق پر یعنی اسلام پر جمع ہو جانا ہو یعنی اکثر حصہ ان کا اسلام قبول کر لے گا۔ اور اسی کے بالمقابل اگلی آیت میں کافروں کا ذکر ہو سکتا ہے اور ﴿لِيُظۡهِرَهٗ عَلَى الدِّيۡنِ كُلِّهٖ﴾ صاف بتاتا ہے کہ آخر کار اسلام کو کثرت سے لوگ قبول کر لیں گے۔

1967 - ﴿عِبَادِىۡ﴾ سے مراد مسیح اور ملائکہ لیے گئے ہیں۔ (ج) مگر جیسا کہ اگلی آیات ظاہر کریں گی یہاں بالخصوص حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہی مراد ہیں اور یہ کافر عیسائی ہیں۔

سورت کا خاتمہ عیسائی اقوام کی آخری حالت پر کیا ہے اور یہاں بتایا ہے کہ مسیح کی عبادت کرنے والے یہ خیال نہ کریں کہ مسیح کی عبادت انہیں حق کے انکار کی سزا سے بچا سکے گی یا مسیح کی عبادت کر کے وہ فلاح پا جائیں گے۔ نُزُلٌ پہلی چیز ہوتی ہے جو مہمان کے لیے تیار کی جاتی ہے۔ اس لیے جہنم کے لفظ میں اشارہ اس دنیا کی سزا کی طرف بھی ہے۔ کیونکہ انسان کی ہوس بالآخر اس دنیا

قُلْ هَلْ نُنَبِّئُكُمْ بِالْاَخْسَرِيْنَ اَعْمَالًا ﴿۱۰۳﴾

کہہ کیا ہم تمہیں عملوں میں بہت بڑھ کر گھاٹے میں رہنے والوں کی خبر دیں۔

اَلَّذِيْنَ ضَلَّ سَعْيُهُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَ هُمْ يَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ يُحْسِنُوْنَ صُنْعًا ﴿۱۰۴﴾

وہ جن کی کوشش دنیا کی زندگی میں برباد ہوگئی اور وہ سمجھتے ہیں کہ وہ صنعت کے بہت اچھے کام بنا رہے ہیں۔ (1968)

اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ وَ

یہی وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنے رب کی باتوں اور اس

کو بھی اس کے لیے دوزخ بنا دیتی ہے۔

1968- صَنْعَةٌ۔ صَنَعَ۔ صُنْع۔ صَنْعَة ہاتھ کے عمل کو کہتے ہیں ﴿وَ يَصْنَعُ الْفُلْكَ﴾[هود: 38:11] ''اور وہ کشتی بنانے لگا'' ﴿وَ اصْنَعِ الْفُلْكَ﴾[هود: 37:11] ''اور کشتی بنا'' ﴿وَ عَلَّمْنٰهُ صَنْعَةَ لَبُوْسٍ لَّكُمْ﴾[الأنبيآء: 80:21] ''اور ہم نے اسے تمہارے لیے زرہ بنانی سکھائی۔'' اور صُنْعَ کے معنی [اِجَادَةِ الْفِعْل] ہیں یعنی ایک کام کا جید بنایا۔ فِعل عام ہے اور حیوانات وغیرہ کی طرف منسوب ہوجاتا ہے مگر یہ نہیں۔ (غ) ﴿صُنْعَ اللّٰهِ الَّذِيْٓ اَتْقَنَ كُلَّ شَيْءٍ﴾[النمل: 88:27] ''اللہ کا کام ہے جس نے ہر چیز کو مضبوط بنایا۔''

عیسائی اقوام کی صنعت:

سیدنا ابن عباس، سیدنا سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہم اور مجاہد رحمہ اللہ سے مروی ہے کہ جن لوگوں کا یہاں ذکر ہے وہ یہود و نصاریٰ ہیں۔ (ر) اور حق یہ ہے کہ جس قدر یہ لفظ آج نصاریٰ قوموں کی حالت پر صادق آتے ہیں ایسا کسی قوم پر صادق نہیں آئے۔ یہی اقوام ہیں جن کی ساری کوشش دنیا کی زندگی کے لیے ہے۔ یہاں تک کہ ان کے پادریوں کے مدنظر بھی دنیوی طور پر دوسری قوموں پر غالب آنا ہے۔ اور بلحاظ اکثریت کہا جا سکتا ہے کہ یورپ اور امریکہ کی نصاریٰ اقوام دنیا میں بکلی منہمک ہیں۔ شب و روز یہی فکر ہے کہ دنیا میں کس طرح ترقی کریں، مال و دولت کن کن ذرائع سے آ سکتا ہے۔ ﴿ضَلَّ سَعْيُهُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا﴾ اور اس کوشش کا برباد ہونا اس لیے کہا کہ ان چیزوں کو اخلاق انسانی سے کچھ تعلق نہیں اور جو چیز باقی رہتی ہے وہ اخلاق سے ہی تعلق رکھتی ہے۔ آسائش جسمانی کی کوئی چیز باقی نہیں رہتی۔ اور صُنْعَ کے لفظ میں اگر ایک طرف ان کے ہاتھ کی کاریگری کے کاموں کی طرف اشارہ کیا ہے جس میں یہ اقوام کل دنیا پر سبقت لے گئی ہیں تو دوسری طرف یہ بھی بتایا ہے کہ یہ ان کا گمان باطل ہے کہ یہ کوئی بڑے جید اور اعلیٰ درجہ کے کام ہیں۔

لِقَآىِٕهٖ فَحَبِطَتۡ اَعۡمَالُهُمۡ فَلَا نُقِيۡمُ لَهُمۡ يَوۡمَ الۡقِيٰمَةِ وَزۡنًا ﴿۱۰۵﴾

کی ملاقات کا انکار کیا، سو ان کے عمل ان کے کام نہ آئے اس لیے ہم قیامت کے دن ان کے لیے وزن قائم نہیں کریں گے۔ (1969)

ذٰلِكَ جَزَآؤُهُمۡ جَهَنَّمُ بِمَا كَفَرُوۡا وَ اتَّخَذُوۡۤا اٰيٰتِىۡ وَرُسُلِىۡ هُزُوًا ﴿۱۰۶﴾

یہ ان کی سزا ہے (یعنی) دوزخ۔ اس لیے کہ انہوں نے کفر کیا اور میری باتوں اور میرے رسولوں کو ہنسی بنایا۔

اِنَّ الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ كَانَتۡ لَهُمۡ جَنّٰتُ الۡفِرۡدَوۡسِ نُزُلًا ﴿۱۰۷﴾

جو ایمان لاتے اور اچھے عمل کرتے ہیں ان کے لیے فردوس کے باغ مہمانی ہیں۔ (1970)

خٰلِدِيۡنَ فِيۡهَا لَا يَبۡغُوۡنَ عَنۡهَا حِوَلًا ﴿۱۰۸﴾

انہی میں رہیں گے وہاں سے جگہ بدلنا نہیں چاہیں گے۔

قُلۡ لَّوۡ كَانَ الۡبَحۡرُ مِدَادًا لِّكَلِمٰتِ رَبِّىۡ لَنَفِدَ الۡبَحۡرُ قَبۡلَ اَنۡ تَنۡفَدَ كَلِمٰتُ رَبِّىۡ وَلَوۡ جِئۡنَا بِمِثۡلِهٖ مَدَدًا ﴿۱۰۹﴾

کہہ اگر سمندر میرے رب کے کلمات کے لیے سیاہی بن جائے تو سمندر ختم ہو جائے گا قبل اس کے کہ میرے رب کے کلمات ختم ہوں گو ہم اسی جیسا (اور اس کی) مدد کو لائیں۔ (1971)

1969 - قیامت کے دن ان کے لیے وزن قائم نہیں ہوگا اس لیے کہ وزن تو ان افعال کا ہے جو ﴿اِبۡتِغَآءَ مَرۡضَاتِ اللّٰهِ﴾ کیے جاتے ہیں۔

1970 - فِرۡدَوۡس۔ فِرۡدَوۡسٌ کو بعض نے مغرب کہا ہے اور بعض نے اسے عربی قرار دیا ہے [كَرْمٌ مُفَرْدَسٌ] کے معنی ہیں مُعَرَّشٌ یعنی ٹٹی پر چڑھائے ہوئے۔ بعض کے نزدیک اس کے معنی محض باغ ہیں یا سرسبز وادی یا وہ ایسا باغ ہے جس میں وہ تمام اشیاء جمع ہوں جو باغوں میں ہوتی ہیں۔ (ل) اور حدیث نبوی میں جو بخاری و مسلم میں ہے اسے [وَسَطُ الْجَنَّة] اور [اَعلَى الْجَنَّة] کہا ہے یعنی جنت کا بہترین اور سب سے بلند مقام۔ (د)

1971 - مَدَّ۔ مَدَادًا۔ مِدَادًا۔ مَدّ کے معنی کھینچنا یا لمبا کرنا ہیں [دیکھو نمبر: 1711]۔ اور مِدَادٌ سیاہی کو اس لیے کہتے ہیں جس سے لکھا جاتا ہے اور [مَدَّ الدَّواة] اور [اَمَدَّهَا] دونوں کے معنی ہیں دوات میں سیاہی ڈالی یا اور زیادہ کی۔ اور بعض نے کہا کہ مِدَادٌ سیاہی کو اس لیے کہتے ہیں کہ وہ کاتب کو مدد دیتی ہے۔ (ل)

قُلۡ اِنَّمَاۤ اَنَا بَشَرٌ مِّثۡلُكُمۡ يُوۡحٰۤى اِلَىَّ اَنَّمَاۤ اِلٰهُكُمۡ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ‌ ۚ فَمَنۡ كَانَ يَرۡجُوۡا لِقَآءَ رَبِّهٖ فَلۡيَعۡمَلۡ عَمَلًا صَالِحًا وَّلَا يُشۡرِكۡ بِعِبَادَةِ رَبِّهٖۤ اَحَدًا ﴿۱۱۰﴾ ع 12 9 3

کہہ میں صرف تمہاری طرح بشر ہوں (لیکن) میری طرف وحی کی جاتی ہے کہ تمہارا معبود ایک ہی معبود ہے۔ پس جو کوئی اپنے رب کی ملاقات کی امید رکھتا ہے تو چاہیے کہ وہ اچھے عمل کرے اور اپنے رب کی عبادت میں کسی کو شریک نہ کرے۔ (1972)

اللہ تعالیٰ کے لاانتہا کلمات میں سے مسیح ایک کلمہ ہے:

اصل مضمون تو یہ تھا کہ جو لوگ مسیح کو خدا بناتے ہیں وہ غلطی پر ہیں اور انہی کے مقابل پر ایمان والوں کا ذکر کیا تھا۔ تو اس مضمون کا کہ اللہ تعالیٰ کے کلمات لاانتہا ہیں یہاں کیا تعلق ہے؟ روح المعانی میں ہے کہ کلمات اللہ سے مراد اللہ تعالیٰ کی معلومات ہیں مگر معلومات کے لیے بولنا ضروری نہیں۔ اور کَلِمَةٌ کے معنی کلام یا بات ہیں [دیکھو نمبر: 57]۔ دوسری طرف قرآن کریم میں ہے ﴿اِنَّمَاۤ اَمۡرُهٗۤ اِذَاۤ اَرَادَ شَيۡـًٔا اَنۡ يَّقُوۡلَ لَهٗ كُنۡ فَيَكُوۡنُ ﴿۸۲﴾﴾ [یٰسٓ: 82:36] ''اس کا حکم جب وہ کسی چیز کا ارادہ کرتا ہے صرف یہی ہوتا ہے کہ اسے کہتا ہے ہوجا، سو وہ ہوجاتی ہے۔'' جس سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کی ہر مخلوق اس کے کلمہ سے پیدا ہوتی ہے۔ اور حضرت مسیح کو جو کَلِمَةٌ کہا ہے تو اس سے بھی اصل مراد یہی ہے کہ وہ اس کی مخلوق ہے نہ خدا یا خالق۔ اور عیسائیوں نے چونکہ مسیح کے کلمہ ہونے پر بڑی ٹھوکر کھائی ہے اور وہ کلمۃ کو خدا کا مترادف ہی قرار دیتے ہیں ''اور کلام خدا تھا'' [یوحنا: 1:1] تو اس لیے اللہ تعالیٰ نے یہاں فرمایا ہے کہ ساری مخلوق ہی اس کے کلمے ہیں، ایک مسیح ہی کلمہ نہیں۔ اور وہ مخلوق اتنی بڑی ہے کہ یہ اس زمین کا جو سمندر ہے اگر وہ سیاہی بن جائے تو خدا کی مخلوق لکھ کر ختم نہیں ہوتی۔ پس ان الفاظ میں بھی عیسائی مذہب کی غلطی کو ہی واضح کیا ہے اور یہی وجہ ہے کہ اگلی آیت میں رسول اللہ ﷺ کی بشریت کا ذکر کیا۔

1972 - **عیسائیت کی تردید اور نسل انسانی کے لیے خوشخبری:** سورت کا خاتمہ ایک ایسی آیت پر کیا ہے جو نہ صرف عیسائی مذہب کی بنیاد ہی کو گرا دیتی ہے بلکہ انسان کے سامنے ترقیات کا ایک نہایت کھلا میدان لاکر اسے اعلیٰ سے اعلیٰ منازل روحانی پر پہنچنے کی خوش خبری سناتی اور ان منازل کو حاصل کرنے کے لیے اس کی ہمت بندھاتی ہے۔

﴿بَشَرٌ مِّثۡلُكُمۡ﴾ میں تمہاری طرح ایک بشر ہوں۔ پس تم میری پیروی تو کر سکتے ہو لیکن جو تمہارے اعتقاد ہیں کہ تم جیسا بشر نہ تھا اس کی پیروی تم کیونکر کر سکتے ہو۔ اس کا آنا نہ آنا تمہارے لیے برابر ہے۔ کیونکہ انسان انسان کے قدم بقدم تو چل سکتا ہے مگر خدا کے قدم بقدم نہیں چل سکتا۔ دوسری طرف ﴿بَشَرٌ مِّثۡلُكُمۡ﴾ کہہ کر ہمیں یہ خوشخبری سنائی کہ وہ مقامات عالیہ جن پر محمد رسول اللہ ﷺ پہنچے انہی کو اپنی اپنی استعداد کے مطابق تم بھی حاصل کر سکتے ہو۔ اس لیے کہ جیسے وہ بشر تھے تم بھی بشر ہو، اور بشر بشر کے نقش قدم پر چل سکتا ہے۔ ہاں ہر شخص اپنی استعداد اور اپنے حالات کے مطابق ان مقامات عالیہ پر پہنچ سکتا ہے لیکن جو کچھ موہبت سے ملتا ہے جیسے نبوت اس میں انسان کی کوشش کا کوئی دخل نہیں۔

سورۃ مریم

نام:

اس سورت کا نام مریم ہے اور یہ نام خود نبی کریم ﷺ سے مروی ہے اور اس میں 6 رکوع اور 98 آیات ہیں۔ اور مریم حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی والدہ کا نام ہے۔ اور چونکہ اس سورت میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا ذکر کر کے عیسائیت پر اتمام حجت کیا ہے اس لیے اس سورت کا نام حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی والدہ کے نام پر رکھا ہے۔ اس سورت کے پڑھنے سے معلوم ہوگا کہ اس میں تمام انبیاء کی بے گناہی یا عصمت پر زور دیا گیا ہے۔ اور یوں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا جو خاص امتیاز عیسائی قائم کرتے ہیں اسے باطل کیا گیا ہے۔ یہ خاص امتیاز حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی عصمت ہے جو عیسائیوں کے نزدیک دوسرے کسی نبی کو حاصل نہیں ہوئی۔ اللہ تعالیٰ نے اس سورت میں اس کے مقابل پر حضرت یحییٰ علیہ السلام کو پاکیزہ اور بے گناہ فرمایا، کہیں حضرت ابراہیم علیہ السلام کو صدیق قرار دے کر تمام گناہوں سے پاک ثابت کیا ہے، کہیں حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ہر قسم کے کھوٹ سے پاک قرار دیا ہے، کہیں حضرت اسماعیل علیہ السلام کی عصمت بیان فرمائی ہے۔ اور پھر ان تمام باتوں کے ساتھ سورت کا نام مریم رکھ کر یہ توجہ دلائی ہے کہ عیسائیوں کے عقیدہ کے بموجب گناہ دنیا میں عورت کی وجہ سے آیا۔ پس اگر وہ گناہ ورثہ میں ملتا ہے جس کی وجہ سے تمام انبیاء کو گنہگار قرار دیا جاتا ہے تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام بھی اس سے خالی نہیں۔ جو ایک عورت کے پیٹ سے پیدا ہوئے اور خود ان کی اپنی کتاب میں لکھا ہے کہ ''وہ جو عورت سے پیدا ہوا ہے کیوں کر پاک ٹھہرے۔'' [ایوب: 4:25]

خلاصہ مضمون:

اس سورت کی ابتدا حضرت زکریا علیہ السلام کے ذکر سے کی ہے جس کے لیے [دیکھو نمبر: 1974] اور

① پہلے رکوع میں حضرت یحییٰ علیہ السلام کا ذکر ہے جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ساتھ نبی تھے۔ اور اس ذکر میں نہ صرف حضرت یحییٰ علیہ السلام کی بے گناہی پر زور دیا ہے بلکہ یہ بھی سمجھایا ہے کہ اس زمانہ میں صرف بنی اسرائیل کی ہدایت کے لیے بھی اکیلے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کافی نہ تھے۔ اس لیے آپ کے ساتھ ایک دوسرے نبی کے کھڑا کرنے کی ضرورت پیش آئی۔

② دوسرے رکوع میں حضرت مریم علیہا السلام کے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو حمل میں لینے اور جننے اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی نبوت کا ذکر ہے اور ان تمام باتوں میں یہ دکھایا ہے کہ وہ انسان سے بڑھ کر کچھ نہیں۔ یہاں تک کہ یہودیوں کے اعتراضات کا جواب دیتے ہوئے بھی مسیح کے خدائی عقیدہ کا بطلان کیا ہے۔

③ تیسرے رکوع میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ذکر کیا ہے جو بوجہ اپنی مقبولیت عامہ کے حضرت مسیح علیہ السلام سے بھی بڑھے ہوئے ہیں۔ اور

ان پر جو ایک ہی الزام تھا کہ انہوں نے جھوٹ بولا اس کی تردید کی ہے۔

④ چوتھے رکوع میں حضرت موسیٰ علیہ السلام، حضرت اسماعیل علیہ السلام اور بعض دیگر انبیاء کا ذکر کر کے اور ان کی معصومیت ثابت کر کے یہ بتایا ہے کہ سلسلہ نبوت ابتدائے آفرینش سے چلتا ہے۔

⑤ پانچویں رکوع میں بتایا ہے کہ عیسائیت کو جن سامانوں پر اور جس مال و دولت پر فخر ہے یہ سامان آخر اس سے چھن جائیں گے۔

⑥ اور چھٹے میں بتایا ہے کہ عقیدۂ ابنیت مسیح دنیا میں باقی نہیں رہ سکتا اور تمام صالحین کے سردار حضرت محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت دنیا میں پھیل جائے گی۔

تعلق:

اس سورت کا تعلق پچھلی سورت سے ظاہر ہے۔ اس میں تاریخ عیسائیت بیان کی ہے اور اس میں عقیدتاً عیسائیت پر اتمام حجت کیا ہے اور عقیدۂ ابنیت مسیح کا جو عیسائیت کا بنیادی پتھر ہے ابطال کیا ہے۔ اور یہ بھی بتایا ہے کہ یہ عقیدہ دنیا میں باقی نہیں رہ سکتا۔ گویا یہ سمجھنا چاہیے کہ دونوں سورتوں کا ایک ہی مضمون ہے۔ اور یہ دونوں سورتیں پوری کی پوری عیسائیت پر ہیں۔

زمانہ نزول:

اس سورت کے زمانہ نزول کے لیے دیکھو سورۂ بنی اسرائیل کے زمانہ نزول پر نوٹ۔ اور خاص اس سورت کے متعلق یہ امر تاریخی طور پر ثابت ہے کہ ہجرت حبش کے وقت جو پانچویں سال بعثت نبوی میں ہوئی یہ سورت نجاشی کے سامنے پڑھی گئی۔ اور چونکہ یہ واقعہ ابتدائے ہجرت کا ہی ہے کیونکہ کفار قریش نے اسی وقت مہاجرین کے پیچھے اپنا وفد نجاشی کے پاس بھیجا تھا اور اسی وفد کی شکایت پر نجاشی نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق مسلمانوں کا عقیدہ دریافت کیا تھا۔ اس لیے یہ امر قریباً ثابت شدہ ہے کہ یہ سورت چوتھے سال بعثت نبوی کی یا پانچویں سال کے آغاز کی ہے اور یہ کل کی کل مکی ہے۔

اٰيَاتُهَا 98 (19) سُوْرَةُ مَرْيَمَ مَكِّيَّةٌ (44) رُكُوْعَاتُهَا 6

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ — اللہ بے انتہا رحم والے بار بار رحم کرنے والے کے نام سے

كٓهٰيٰعٓصٓ ۝١ — کافی، ہادی، برکت والا، عالم، صادق (خدا)(1973)

ذِكْرُ رَحْمَتِ رَبِّكَ عَبْدَهٗ زَكَرِيَّا ۝٢ — (یہ) تیرے رب کی رحمت کا ذکر اپنے بندے زکریا پر ہے۔

اِذْ نَادٰى رَبَّهٗ نِدَآءً خَفِيًّا ۝٣ — جب اس نے اپنے رب کو چپکے سے پکارا۔(1974)

1973 - ﴿كٓهٰيٰعٓصٓ﴾۔ام ہانی رضی اللہ عنہا نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ان حروف کے معانی میں روایت ہے کہ اس سے مراد اسمائے الٰہی کاف، ھاد، عالم، صادق ہیں۔اس صورت میں یا بطور حرف ندا ہوگی اور ابن اثیر میں سعید بن جبیر کی تفسیر میں (لفظ یمن کے نیچے) مذکور ہے۔ کاف، ھاد، یمین، عزیز، صادق جہاں یا کو یمین کے قائم مقام ٹھہرایا ہے اور یا من اور یمین کے معنی برکت والا دیئے ہیں۔جیسے قادر اور قدیر کے معنی قدرت والا ہیں۔

1974 - خَفِيًّا۔خفی وہ ہے جو دوسروں پر ظاہر نہ ہو اور ندا کے خفی ہونے سے مراد یہ ہے کہ اس کی آواز لوگوں سے مخفی تھی۔

اس سورت کی ابتدا حضرت زکریا علیہ السلام کے ذکر سے کرنے میں یہ بتایا ہے کہ خود حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں ان سے پہلے ایسے پاک اور نیک لوگ تھے جن کے متعلق خود انجیل میں موجود ہے کہ وہ اور اس کی بیوی

''دونوں خدا کے حضور راستباز اور خداوند کے سارے حکموں اور قانونوں پر بے عیب چلنے والے تھے۔''[لوقا: 6:1]

چونکہ اصل غرض اس سورت کی عیسائیت پر اتمام حجت ہے اور یہ اتمام حجت حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی خاص بے گناہی کو جس پر عیسائی زور دیتے ہیں مٹا کر کیا ہے اور تمام انبیاء کو بے گناہ ثابت کیا ہے۔اس لیے سورت کی ابتدا اس شخص کے ذکر سے کی ہے جس کے متعلق خود عیسائیوں کی کتابوں میں یہ اعتراف موجود ہے کہ وہ خدا کے حضور راستباز اور بے عیب تھا۔نہ صرف وہی بلکہ اس کی بی بی بھی باوجود عورت ہونے کے بے گناہ تھی۔

دعا اور اخفا اور تضرع:

دعا کے متعلق اصول دوسری جگہ بیان فرمایا ﴿اُدْعُوْا رَبَّكُمْ تَضَرُّعًا وَّ خُفْيَةً﴾[الأعراف: 55:7] ''اپنے رب کو عاجزی سے اور چھپ کر پکارو۔'' اور تضرع گڑگڑانا ہے۔پس چھپ کر دعا کرنا تضرع کے خلاف نہیں۔ بلکہ زیادہ تر تضرع اسی دعا میں پیدا ہوتا

قَالَ رَبِّ اِنِّیۡ وَهَنَ الۡعَظۡمُ مِنِّیۡ وَ اشۡتَعَلَ الرَّاۡسُ شَيۡبًا وَّ لَمۡ اَكُنۡۢ بِدُعَآئِكَ رَبِّ شَقِيًّا ۝۴

کہا، میرے رب میری ہڈیاں کمزور ہوگئیں اور سر بالوں کی سفیدی سے شعلے مار رہا ہے اور میرے رب تجھ سے دعا کر کے میں محروم نہیں رہا۔ (1975)

ہے جو لوگوں سے چھپ کر کی جائے۔ ہمارے نبی کریم ﷺ علاوہ ان دعاؤں کے جو نماز میں مخلوق خدا کے لیے کرتے رہے زیادہ تر دعارات کی نماز میں یعنی تہجد میں کرتے تھے۔ جو وقت ہی ایسا تھا کہ کسی دوسرے کو اطلاع نہ ہوتی تھی۔ اور یہ حکم کثرت پر ہے، ہر دعا کے لیے مخفی ہونا ضروری نہیں۔ بعض دعائیں جماعت میں بھی کی جاتی ہیں اور دعائے جماعت بھی ایک خاص کیفیت تضرع پیدا کرتی ہے۔ مگر بیشتر حصہ دعا کا وہی ہونا چاہیے جو دوسروں سے الگ ہو کر کی جائے۔

1975 - عَظۡمُ۔ عِظَامٌ ہڈی کو کہتے ہیں ﴿فَكَسَوۡنَا الۡعِظٰمَ لَحۡمًا﴾ [المؤمنون: 14:23] ''پھر ہڈیوں پر گوشت چڑھایا۔'' اور عَظۡمَ کے اصل معنی ہیں ایک چیز کی ہڈی بڑی ہوگئی۔ پھر ہر ایک طرح بڑا ہو جانے پر بولا گیا ہے معقول ہو یا محسوس۔ اسی سے عظیم ہے۔ اور یہاں مفرد کا استعمال جنس پر دلالت کرنے کے لیے ہے۔

اشۡتَعَلَ۔ شَعَلَ آگ کے شعلہ مارنے پر بولا جاتا ہے۔ اور اِشۡتِعَالٌ کا لفظ غضب میں آنے پر بولا جاتا ہے۔ اور رنگ کی تشبیہ کے لحاظ سے سفیدہ کے چھا جانے پر بولا جاتا ہے جیسے یہاں۔

شَيۡبٌ۔ بالوں کی سفیدی کو کہتے ہیں۔ (غ۔ل)

قبولیت زکریا علیہ السلام اور اس کی وجہ:

﴿بِدُعَآئِكَ﴾ کے معنی دو طرح پر ہو سکتے ہیں۔ تجھ سے دعا کر کے یا تیرے مجھے اپنی اطاعت کی طرف بلانے سے۔ تو صورت اول میں مراد یہ ہوئی کہ تجھ سے دعا کر کے میں بھلائی سے محروم نہیں رہا۔ یہ شاید اس لیے کہا کہ اس زمانہ میں لوگ ظاہر طور پر دعائیں بھی کرتے تھے اور پھر خدا سے دور بھی پڑے ہوئے تھے۔ تو بتایا کہ اخلاص کی دعا کو تو ضائع نہیں کرتا۔ اور دوسری صورت میں یہ مطلب ہے کہ تیری طاعت کو قبول کر کے میں کسی بھلائی سے محروم نہیں رہا۔ مطلب دونوں صورتوں میں ایک ہے۔ یعنی خدا کا ہو کر انسان نقصان نہیں اٹھاتا ہے۔ گو عام طور پر یہی معنی کیے گئے ہیں کہ اس سے مراد یہ ہے کہ آپ کی سب دعائیں قبول ہوتی رہی ہیں۔ مگر میرے نزدیک اس بات کو پیش کرنے کا یہ موقعہ نہیں۔ یہ مطلب نہیں ہو سکتا کہ میری پہلی دعائیں قبول ہوتی رہی ہیں تو یہ بھی قبول فرما۔ بلکہ اس وقت کی حالت عامہ کا نقشہ کھینچا ہے کہ یہ لوگ تیرے بندے نہیں بنتے، تجھ سے اخلاص سے دعا نہیں کرتے، تیری طاعت نہیں کرتے، اس لیے بھلائیوں سے محروم ہیں۔ میں نے تیری عبادت کی اور طاعت کی اور سب کچھ پایا۔ اور بڑھاپے کا ذکر اس لیے کیا کہ اب انہیں نظر آ رہا تھا کہ ان کی موت کا وقت قریب ہے۔ بعد میں اس قوم کی حالت کیسی ہوگی۔ جیسا کہ اگلی آیت میں صاف کر دیا ہے۔ ﴿وَ اِنِّیۡ خِفۡتُ الۡمَوَالِیَ مِنۡ وَّرَآءِیۡ﴾ یعنی جو میرے

وَ اِنِّیۡ خِفۡتُ الۡمَوَالِیَ مِنۡ وَّرَآءِیۡ وَ کَانَتِ امۡرَاَتِیۡ عَاقِرًا فَهَبۡ لِیۡ مِنۡ لَّدُنۡكَ وَلِیًّا ۙ﴿۵﴾

اور میں اپنے بھائی بندوں سے اپنے پیچھے ڈرتا ہوں اور میری عورت بانجھ ہے سو اپنے پاس سے مجھے کوئی وارث عطا فرما۔

یَّرِثُنِیۡ وَ یَرِثُ مِنۡ اٰلِ یَعۡقُوۡبَ ۫ وَ اجۡعَلۡهُ رَبِّ رَضِیًّا ﴿۶﴾

جو میرا ورثہ لے اور آل یعقوب کا ورثہ لے اور اے میرے رب اسے پسندیدہ بنائیو۔ (1976)

یٰزَکَرِیَّاۤ اِنَّا نُبَشِّرُكَ بِغُلٰمِ

اے زکریا ہم تجھے ایک لڑکے کی خوش خبری دیتے ہیں

بھائی بندے نظر آتے ہیں اپنی موت کے بعد (﴿مِنۡ وَّرَآءِیۡ﴾ کے یہی معنی ہیں) میں ڈرتا ہوں کہ ان شریر لوگوں سے قوم کو بجائے فائدہ کے نقصان پہنچے۔

1976 - رَضِیّ۔ کے معنی دونوں طرح ہو سکتے ہیں۔ مرضی یعنی وہ جس سے خدا راضی ہو یا راضی جو خدا سے راضی ہو ﴿رَاضِیَةً مَّرۡضِیَّةً﴾ [الفجر: 28:89] ''تو اس سے راضی وہ تجھ سے راضی۔'' رضا کے لیے [دیکھو نمبر: 386]

زکریا علیہ السلام کے ورثہ سے مراد:

حضرت زکریا علیہ السلام کو کیا فکر تھی؟ یہ کہ ان کے پیچھے قوم کو کوئی نیک رستہ پر ڈالنے والا نظر نہیں آتا۔ یا یہ کہ کوئی جائیداد انہوں نے بڑی محنت سے پیدا کی ہے، ان کے پیچھے اسے کوئی سنبھالنے والا نظر نہیں آتا۔ کیا انبیاء اور صلحاء کو اپنی جائیداد کی فکر ہوا کرتی ہے یا اپنی قوم کی؟ اہل تشیع نے اور ان کے تتبع میں آج کل ایک غلطی خوردہ فرقہ نے یہ خیال کیا ہے کہ یہاں یَّرِثُنِیۡ سے مراد یہ ہے کہ میری جائیداد کا وارث ہو۔ مگر اس سے بڑھ کر ایک راستباز کی کوئی ہتک نہیں ہو سکتی کہ اس کے متعلق یہ کہا جائے کہ بڑھاپے کو پہنچ کر اور موت کا نظارہ سامنے دیکھ کر اسے یہ فکر ہو کہ میری جائیداد کو چچا کے بیٹے سنبھال لیں گے۔ اس لیے وہ دعا کرتا ہے کہ مجھے ایک بیٹا ملے جو اس جائیداد کو سنبھال لے۔ میں کہتا ہوں کہ یہ الفاظ قرآنی کی تحقیر ہے۔ اور پھر اس کے ساتھ جو ﴿یَرِثُ مِنۡ اٰلِ یَعۡقُوۡبَ﴾ کے لفظ بڑھائے ہیں وہ ان باطل خیالات کا قلع قمع کرنے کے لیے کافی ہیں کیا آل یعقوب کی بھی کوئی جدی جائیداد چلی آتی تھی جو زکریا علیہ السلام کو بھی نہ ملی تھی اور اب وہ چاہتے ہیں کہ حضرت یعقوب علیہ السلام کی کچھ زمینیں اور املاک چلی آتی ہیں ان کا وارث بھی یہی لڑکا ہو؟ یہ سب بودے خیالات ہیں۔ راستبازوں کی وراثت علم اور ہدایت ہوتی ہے۔ سلسلہ اسرائیل یعنی آل یعقوب میں اللہ تعالیٰ نے اپنی خاص روحانی نعمت ہدایت قوم رکھی تھی، پس وہی مراد ہے۔ اور اپنے ورثہ سے مراد ان علوم کا وارث ہونا ہے جو آپ کو دیئے گئے تھے۔

اِسۡمُهٗ يَحۡيٰى ۙ لَمۡ نَجۡعَلۡ لَّهٗ مِنۡ قَبۡلُ سَمِيًّا ۝ اس کا نام یحییٰ ہے۔ ہم نے اس کا کوئی نظیر پہلے نہیں بنایا۔(1977)

1977 - مُسَمّٰی کے لیے[دیکھو نمبر: 1627] ہمنام اور نظیر اس کے معنی ہیں اور یہاں شبیہ یا نظیر مجاہد اور عطا سے مروی ہیں۔(د)

یحییٰ علیہ السلام کی بے نظیری سے مراد:

یحییٰ نام پر[دیکھو نمبر: 414] انجیل میں ہے کہ

''آٹھویں دن ایسا ہوا کہ وہ لڑکے کا ختنہ کرنے آئے اور اس کے باپ کے نام پر زکریا رکھنے لگے۔ مگر اس کی ماں نے کہا نہیں بلکہ اس کا نام یوحنا رکھا جائے۔ انہوں نے اس سے کہا کہ تیرے کنبے میں کسی کا یہ نام نہیں۔''

[لوقا: 1:59-61]

پس اگر سمی کے معنی ہمنام لیے جائیں تو مراد یہی ہوگی کہ اس خاص گھرانے میں پہلے اس نام کا کوئی آدمی نہیں ہوا۔ اگر فی الواقع اس نام کا آدمی پہلے کوئی نہ ہوا ہو تو یہ کوئی خوبی کی بات نہیں جس کا ذکر قرآن شریف میں کیا جاتا۔ اس لیے مراد یہی ہے کہ اس کا نظیر کوئی نہیں ہوا۔

یحییٰ علیہ السلام کی بے گناہی:

اب سوال یہ ہے کہ کس معنی میں نظیر نہیں ہوا۔ بعض مفسرین کہتے ہیں اس لیے کہ حضرت یحییٰ علیہ السلام نے نہ اللہ تعالیٰ کی معصیت کی اور نہ کبھی معصیت کا خیال ان کے دل میں آیا۔ اور ایک حدیث بھی ہے[مَا مِنْ أَحَدٍ مِنْ وَلَدِ آدَمَ إِلاَّ قَدْ أَخْطَأَ أَوْ هَمَّ بِخَطِيئَةٍ إِلَّا يَحْيَى بْنَ زَكَرِيَّا لَمْ يَهْمَ بِخَطِيْئَةٍ وَلَمْ يَعْمَلُهَا] (ابن کثیر، جلد5، صفحہ 218) آدم کے فرزندوں میں سے کوئی نہیں مگر اس نے خطا کی یا خطا کا ارادہ کیا سوائے یحییٰ بن زکریا کے کہ نہ اس نے خطا کا ارادہ کیا اور نہ خطا کی۔ اور عجیب بات یہ ہے کہ انجیل میں بھی اسی قسم کا اعتراف موجود ہے:

''میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ جو عورت سے پیدا ہوئے ان میں یوحنا بپتسمہ دینے والے سے کوئی بڑا نہیں ہوا۔''

[متی: 11:11]

مگر اصل بات یہ ہے کہ یہ امر اسی نسل کے متعلق ہے۔ کیونکہ جیسا کہ یحییٰ کی وجہ تسمیہ میں لکھا گیا ہے[دیکھو نمبر: 414]۔ خود یحییٰ نام میں یہی اشارہ تھا کہ وہ گنہگار نہیں ہوگا۔ جیسی وہ نسل عام طور پر تھی۔ اور خود زکریا علیہ السلام کی دعا یہی بتاتی ہے کہ اور سارا ذکر اسی نسل کا ہے۔ ہاں یہ بھی ہو سکتا ہے کہ الفاظ قرآنی میں یہ بھی اشارہ ہو کہ جن خصوصیات کو یحییٰ لے کر آتا ہے وہ سلسلہ اسرائیلی میں اور کسی کو نہیں دی گئیں۔ اور یہ ان کی نبوت کی طرف اشارہ ہوگا۔ کیونکہ سلسلہ اسرائیلی میں ہر ایک نبی خاص صفات کا مظہر ہو کر آتا

قَالَ رَبِّ اَنّٰى يَكُوۡنُ لِىۡ غُلٰمٌ وَّ كَانَتِ امۡرَاَتِىۡ عَاقِرًا وَّ قَدۡ بَلَغۡتُ مِنَ الۡكِبَرِ عِتِيًّا ۝٨

کہا، میرے رب میرے لڑکا کیسے ہوگا اور میری عورت بانجھ ہے اور میں بڑھاپے کی انتہا کو پہنچ گیا (ہوں)۔[1978]

قَالَ كَذٰلِكَ ۚ قَالَ رَبُّكَ هُوَ عَلَىَّ هَيِّنٌ وَّ قَدۡ خَلَقۡتُكَ مِنۡ قَبۡلُ وَ لَمۡ تَكُ شَيۡـًٔا ۝٩

کہا ایسا ہی ہوگا، تیرے رب نے فرمایا ہے۔ یہ مجھ پر آسان ہے اور پہلے میں نے تجھے پیدا کیا اور تو کچھ چیز نہ تھا۔

قَالَ رَبِّ اجۡعَلۡ لِّىۡۤ اٰيَةً ؕ قَالَ اٰيَتُكَ اَلَّا تُكَلِّمَ النَّاسَ ثَلٰثَ لَيَالٍ سَوِيًّا ۝١٠

کہا میرے رب میرے لیے کوئی نشان مقرر کر دے۔ کہا تیرے لیے نشان یہ ہے کہ تو تین راتیں صحیح وسالم رہ کر لوگوں سے بات نہ کرے۔[1979]

فَخَرَجَ عَلٰى قَوۡمِهٖ مِنَ الۡمِحۡرَابِ فَاَوۡحٰۤى اِلَيۡهِمۡ اَنۡ سَبِّحُوۡا بُكۡرَةً وَّ عَشِيًّا ۝١١

سو وہ عبادت گاہ سے اپنی قوم پر نکلا تو انہیں اشارہ سے کہا کہ صبح اور شام تسبیح کرو۔

تھا، جن کا مظہر دوسرا نبی نہ ہوا ہوتا تھا۔

1978- ﴿عِتِيًّا﴾۔ عَتِیَ (مصدر عُتُوّ اور عِتِیّ) کے معنی ہیں تکبر کیا اور حد سے نکل گیا ﴿عَتَوۡ عُتُوًّا كَبِيۡرًا﴾ [الفرقان: 21:25] ''اور بڑی بھاری سرکشی اختیار کی۔'' ﴿عَتَتۡ عَنۡ اَمۡرِ رَبِّهَا﴾ [الطلاق: 8:65] ''جنہوں نے اپنے رب کے حکم سے سرکشی کی۔'' اور یہاں عِتِیّ سے مراد وہ حالت ہے جس کی اصلاح کا رستہ باقی نہیں رہا۔ (غ) یا انتہا کو پہنچ جانا۔ (ل) ایسے ہی الفاظ سورہ آل عمران میں گزر چکے ہیں۔ [دیکھو نمبر: 416]

1979- ﴿سَوِيًّا﴾۔ سَوِیّ وہ ہے جو اندازہ اور کیفیت میں افراط وتفریط سے محفوظ ہو ﴿اَصۡحٰبُ الصِّرَاطِ السَّوِىِّ﴾ [طٰہٰ: 135:20] ''کون سیدھے رستے پر چلنے والے ہیں۔'' اور [رَجُلٌ سَوِیٌّ] وہ ہے جو اخلاق میں اور خلقت میں افراط وتفریط سے محفوظ ہو۔ (غ) جمہور نے سویّ کے معنی یہی لیے ہیں یعنی صحیح سالم ہونے کی حالت میں۔ جس میں کوئی گونگا پن وغیرہ نہیں۔ (د) باقی تشریح کے لیے [دیکھو نمبر: 417]

يٰيَحۡيٰى خُذِ الۡكِتٰبَ بِقُوَّةٍ‌ؕ وَ اٰتَيۡنٰهُ الۡحُكۡمَ صَبِيًّا ۙ﴿۱۲﴾

اے یحییٰ کتاب کو مضبوطی سے پکڑ، اور ہم نے اسے لڑکپن کی حالت میں فہم دیا۔[1980]

وَّ حَنَانًا مِّنۡ لَّدُنَّا وَ زَكٰوةً‌ؕ وَ كَانَ تَقِيًّا ۙ﴿۱۳﴾

اور اپنے پاس سے رحم دلی اور پاکیزگی (دی تھی) اور وہ (گناہ سے) بچنے والا تھا۔[1981]

وَّ بَرًّا بِوَالِدَيۡهِ وَ لَمۡ يَكُنۡ جَبَّارًا عَصِيًّا ﴿۱۴﴾

اور اپنے ماں باپ سے نیکی کرنے والا تھا اور سرکش نافرمان نہیں تھا۔

1980 - حُكۡمَ ۔[دیکھو نمبر: 1370]۔ یہاں مراد حکمت ہے یا کتاب اللہ کا فہم۔(ج)

یہاں کتاب سے مراد عموماً مفسرین نے توریت کو لیا ہے۔ اگر توریت ہی مراد ہو تو حرج نہیں۔ اس لیے کہ کل انبیاء بنی اسرائیل توریت پر عمل کرتے اور کراتے تھے۔ یہاں تک کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تعلیم میں بھی توریت پر عمل کو ضروری قرار دیا ہے۔ مگر اغلب یہ ہے کہ کتاب سے یہاں مراد حضرت یحییٰ علیہ السلام کی اپنی کتاب ہے۔ اور یہ ان کے زمانہ نبوت کا ذکر ہے۔ اور آگے جو آتا ہے ﴿وَ اٰتَيۡنٰهُ الۡحُكۡمَ صَبِيًّا﴾ تو یہ پہلے زمانہ کا ذکر ہے یعنی وہ باتیں جن کی ضرورت نبوت کے لیے ہوتی ہے وہ شروع سے دی جاتی ہیں۔ جیسے فہم یا حکمت، رحم دلی، پاکیزگی، بدیوں سے بچنا۔ اور یوں عصمت انبیاء کے اصول کو ساتھ ہی قائم کیا ہے اور میرے نزدیک ترجیح کتاب کے اس دوسرے معنی کو ہے۔ کیونکہ ﴿يٰيَحۡيٰى خُذِ الۡكِتٰبَ بِقُوَّةٍ‌﴾ بطور وحی ہے۔

1981 - حَنَانًا۔ حَنِيۡنٌ وہ شوق ہے جس میں شفقت پائی جائے اور حنان سے مراد رحمت ہے۔(غ) اور حنّان اللہ تعالیٰ کے اسماء میں سے ہے یعنی بہت رحم والا۔(ل) اور ﴿حَنَانًا مِّنۡ لَّدُنَّا﴾ کے معنی دو طرح پر ہو سکتے ہیں۔ یعنی اس پر اپنی جناب سے رحمت کی یا یہ کہ اس کے قلب میں اپنی جناب سے رحمت رکھی۔ اور میں نے یہی دوسرے معنی ترجمہ میں لیے ہیں۔ کیونکہ یہاں تین چیزوں کا ذکر ہے جو انبیاء کو شروع سے دی جاتی ہیں۔ جن میں سے پہلی چیز شفقت علی خلق اللہ ہے جو رحم دلی سے پیدا ہوتی ہے اور دوسری بات زکوٰۃ ہے اور تیسری اتقاء۔

زکوٰۃ کے اصل معنی نمو ہیں جو اللہ تعالیٰ کی برکت سے حاصل ہوتا ہے اور اسی سے زکوٰۃ ہے جو مال میں سے دی جاتی ہے۔ اور یہاں اور ﴿غُلٰمًا زَكِيًّا﴾ [19] میں مراد تزکیہ بطور اجتباء ہے اور وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بعض بندوں کو عالم اور طاہر الخلق بناتا ہے۔ نہ اس طرح کہ وہ ان باتوں کو سیکھ کر حاصل کریں بلکہ توفیق الٰہی سے۔(غ) اور چونکہ تقویٰ یا بدی سے بچنے کا ذکر الگ ہے اس لیے مراد اصل معنی یعنی وہ نمو ہیں جو اللہ تعالیٰ کی برکت سے حاصل ہوتا ہے۔ گویا بمقابلہ بدیوں سے بچنے کے یہ نیکیوں میں ترقی ہے۔

وَ سَلٰمٌ عَلَيۡهِ يَوۡمَ وُلِدَ وَ يَوۡمَ يَمُوۡتُ وَ يَوۡمَ يُبۡعَثُ حَيًّا ﴿۱۵﴾ ع 1/15/4

اور اس پر سلامتی ہے جس دن وہ پیدا ہوا اور جس دن وہ مرے اور جس دن وہ زندہ اٹھایا جائے گا۔ (1982)

وَ اذۡكُرۡ فِى الۡكِتٰبِ مَرۡيَمَ ۘ اِذِ انۡتَبَذَتۡ مِنۡ اَهۡلِهَا مَكَانًا شَرۡقِيًّا ﴿۱۶﴾ لا وقف لازم

اور کتاب میں مریم کا ذکر کر کہ جب وہ اپنے لوگوں سے الگ ہو کر ایک مشرقی مکان میں چلی گئی۔ (1983)

1982 - یہاں تین موقعوں پر سلامتی کا ذکر ہے۔ ولادت کے وقت، موت کے وقت، بعثت کے وقت۔ یوں تین زمانوں پر اس سلامتی کا دائرہ وسیع کیا ہے۔ ولادت کے وقت سلامتی وہ ہے جو اس دنیا سے تعلق رکھتی ہے۔ موت کے وقت کی سلامتی حالت قبر یا عالم برزخ کے متعلق ہے اور بعثت کے وقت کی سلامتی وہ جو قیامت سے تعلق رکھتی ہے۔ گویا ہر نبی دنیا میں سلامتی کی حالت میں آتا ہے۔ یعنی شیطان کے حملہ سے محفوظ ہوتا ہے اور موت کے بعد بھی اسے سلامتی ہوتی ہے یعنی عذاب قبر سے محفوظ ہوتا ہے اور قیامت کو سلامت ہے یعنی عذاب جہنم سے محفوظ ہے۔

1983 - ﴿اِنۡتَبَذَتۡ﴾۔ نَبَذَ کے لیے [دیکھو نمبر: 126]۔ اسی سے اِنتَبَذَ کے معنی ہیں الگ ہو گیا۔ اس شخص کا الگ ہونا جو لوگوں کے اندر اپنے نفس کو بہت کم قابل توجہ سمجھتا ہے۔ (غ)

حضرت عیسیٰ اور یحییٰ علیہما السلام کے اکٹھے ذکر میں حکمت:

یہی مضمون یعنی حضرت مریم علیہا السلام اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا ذکر زکریا اور یحییٰ کے ذکر کے ساتھ سورہ آل عمران میں گزر چکا ہے۔ یہاں کچھ مزید تفصیلات ہیں جو وہاں موجود نہیں۔ ان دونوں موقعوں پر حضرت یحییٰ علیہ السلام کی پیدائش میں بھی ایک اعجاز تھا اور اس سے بڑھ کر اعجاز حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش میں تھا۔ لیکن اس لحاظ سے کہا جا سکتا ہے کہ جیسا اعجاز حضرت یحییٰ علیہ السلام کی پیدائش میں ہے۔ ویسا حضرت اسحاق علیہ السلام کی پیدائش میں ہے۔ ان کا ذکر دونوں موقعوں پر کیوں نہ کیا۔ اصل بات یہ ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو حضرت یحییٰ علیہ السلام کے ساتھ اکٹھا کرنے میں عیسائیت پر اتمام حجت ہے۔ عیسائی حضرت مسیح کی بن باپ پیدائش کو اس کی خدائی کی دلیل ٹھہراتے ہیں۔ تو اس کے مقابل حضرت یحییٰ کی پیدائش کا ذکر کیا کہ وہ کم اعجاز نہیں۔ پھر عیسائی حضرت مسیح کی بے گناہی کو اس کی خدائی کی دلیل ٹھہراتے ہیں۔ تو اس کے مقابل حضرت یحییٰ کی بے گناہی کو کس قدر پُرزور الفاظ میں بیان فرماتا ہے۔ پھر اگر مسیح کے لیے پیشگوئی تھی تو یحییٰ کے لیے بھی پیشگوئی تھی۔ [دیکھو نمبر: 414] پھر سب سے بڑھ کر اتمام حجت دونوں کے اکٹھے ذکر میں یوں کیا ہے کہ وہ نبی جو اکیلا ایک قوم بنی اسرائیل کی اصلاح کے لیے کافی نہ تھا وہ اصلاح عالم کا بیڑا کیونکر اٹھا سکتا تھا۔ کیونکہ باوجود اپنی ساری عظمت کے حضرت عیسیٰ علیہ السلام صرف ایک شاخ اخلاق انسانی کی پرورش کے لیے آئے تھے۔ اسی لیے ان کے ساتھ حضرت یحییٰ علیہ السلام کی ضرورت پیش آئی۔ جس طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام جب اکیلے بوجھ کو نہ اٹھا سکے تو ان کے ساتھ حضرت ہارون علیہ السلام کو کھڑا کیا گیا۔ پس اس سارے ذکر کو اس نگاہ سے پڑھنا چاہئے کہ یہ دراصل عیسائیت پر اتمام حجت ہے اور سورۂ آل

فَاتَّخَذَتۡ مِنۡ دُوۡنِهِمۡ حِجَابًا ۖ فَاَرۡسَلۡنَاۤ اِلَيۡهَا رُوۡحَنَا فَتَمَثَّلَ لَهَا بَشَرًا سَوِيًّا ﴿۱۷﴾

پس اس نے ان سے پردہ کرلیا سو ہم نے اپنے کلام کو اس کی طرف بھیجا تو وہ اس کے سامنے ایک پورے انسان کی شکل میں آیا۔ (1984)

عمران اور سورۂ مریم دونوں سورتیں عیسائیت پر اتمام حجت کے طور پر ہیں۔

مریمؑ کا شرقی مکان میں جانا:

مکان شرقی سے مراد مفسرین بیت المقدس کے مشرق کی طرف لیتے ہیں۔ اور یہ بھی لکھا ہے کہ عیسائیوں کے بیت المقدس کی بجائے اپنی عبادت گاہوں کا مشرق کی طرف منہ کرنے کی وجہ یہی ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ یہاں مریم کے پہلے حالات جو بچپن کے زمانہ سے تعلق رکھتے ہیں بیان نہیں ہوئے۔ وہ سورہ آل عمران میں ہیں کہ کس طرح حضرت مریم ہیکل میں (یروشلم میں) رہتی تھیں۔ کیونکہ ان کی ماں نے انہیں ہیکل کی خدمت کے لیے نذر مانا تھا۔ یہاں حضرت مریم کے بلوغ کو پہنچ جانے کے بعد کے حالات ہیں۔ جیسا کہ اگلی آیت میں لفظ حجاب لا کر بتا بھی دیا ہے۔ پس مکان شرقی میں چلے جانے سے مراد یہی ہے کہ جب آپ بلوغت کو پہنچیں اور حیض کے ایام آئے تو اب مسجد میں نہ رہ سکتی تھیں۔ اس لیے کسی شرقی مکان میں چلی گئیں اور غالباً یہ مشرقی مکان ناصرہ تھا۔ یہاں کا رہنے والا یوسف نجار تھا اور حضرت مریم کی اصل رہائش بھی وہیں کی معلوم ہوتی ہے۔ کیونکہ یوسف آپ کے چچا کا بیٹا بھی تھا، اور ناصرہ بیت المقدس سے شمال مشرق کی طرف ہے۔ مگر قرآن کریم نے عموماً شمال جنوب کا ذکر چھوڑ کر مشرق مغرب کا ہی ذکر کیا ہے۔ اس لیے اسے مکان شرقی کہہ دیا۔ یا ممکن ہے کہ کوئی اور مکان شرقی ہو۔ لیکن انجیل سے معلوم ہوتا ہے کہ بیٹے کی خوشخبری ملنے کے وقت حضرت مریم ناصرہ میں تھیں [لوقا: 26:1] بہرحال جیسا کہ اگلی آیت سے معلوم ہوگا کہ یہ جانا اس لیے تھا کہ آپ بوجہ حیض آ جانے کے مسجد میں نہ رہ سکتی تھیں اور اس لیے یہاں لفظ اِنۡتَبَذَتۡ بھی اختیار کیا ہے۔ کیونکہ تکمیل روحانی کے اعلیٰ مقام سے الگ ہو کر جو مسجد میں رہنے سے حاصل تھا اب ایک رنگ کی معمولی گھریلو زندگی اختیار کرنی پڑی۔ جس میں گھر کے دھندے، زوجیت کے تعلقات، اولاد کی پرورش وغیرہ تمام امور شامل ہیں۔

1984- تَمَثَّلَ۔ مَثَّلَ سے ہے [دیکھو نمبر: 30] اور تَمَثَّل کے معنی ہیں ایک چیز کی شبیہ یا مثال بنائی اور [تَمَثَّلَ فُلَانٌ] کے معنی [ضَرَبَ مَثَلًا] بھی آتے ہیں یعنی مثال بیان کی۔ (ل) اور ایک چیز کی مثال ہو گیا۔ (منتہی الارب)

حضرت مریم علیہا السلام کے پردہ میں ہو جانے سے کیا مطلب ہے؟ مفسرین نے مختلف توجیہات کی ہیں۔ بعض کہتے ہیں کہ غسل حیض کے لیے پردہ کیا اور بعض کہتے ہیں کہ ایام حیض میں مسجد سے الگ ہو جانا مراد ہے۔ اور بعض کہتے ہیں کہ عبادت کے لیے۔ مگر عبادت کے لیے تو مسجد موجود تھی اور وہیں حضرت مریم علیہا السلام صغرسنی میں رہتی بھی تھیں ﴿كُلَّمَا دَخَلَ عَلَيۡهَا زَكَرِيَّا الۡمِحۡرَابَ﴾ [آل عمران: 37:3] ''جب کبھی زکریا اس کے پاس عبات گاہ میں آتے۔'' اس لیے اصل بات یہ ہے کہ جب آپ بلوغت کو پہنچیں تو اس لیے چونکہ مسجد کا رہنا آئندہ کے لیے موزوں نہ تھا اس لیے کسی اور مکان میں جانا پڑا۔ بہرحال یہ تبدیلی بلوغت سے تعلق

قَالَتۡ اِنِّیۡۤ اَعُوۡذُ بِالرَّحۡمٰنِ مِنۡكَ اِنۡ كُنۡتَ تَقِیًّا ﴿۱۸﴾

کہا میں تجھ سے رحمٰن کی پناہ مانگتی ہوں، اگر تو متقی ہے۔ (1985)

قَالَ اِنَّمَاۤ اَنَا رَسُوۡلُ رَبِّكِ ۖ لِاَهَبَ لَكِ غُلٰمًا زَكِیًّا ﴿۱۹﴾

اس نے کہا میں صرف تیرے رب کا بھیجا ہوا ہوں تا کہ تجھے ایک پاکیزہ لڑکا بخشوں۔ (1986)

قَالَتۡ اَنّٰی یَكُوۡنُ لِیۡ غُلٰمٌ وَّ لَمۡ یَمۡسَسۡنِیۡ بَشَرٌ وَّ لَمۡ اَكُ بَغِیًّا ﴿۲۰﴾

کہا میرے لڑکا کس طرح ہوگا حالانکہ مجھے کسی انسان نے (نکاح کر کے) چھوا نہیں اور نہ میں بدکار ہوں۔ (1987)

رکھتی ہے، اسی لیے حجاب کا بھی ذکر ہے۔ کیونکہ حجاب سن بلوغت کو پہنچنے پر ضروری ہوتا ہے۔

رُوۡحُ سے مراد اکثر نے یہاں جبریل لیا ہے اور ابو مسلم نے خود حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو۔ مگر [دیکھو نمبر: 1872] روح کے معنی کلام الٰہی بھی ہیں۔ اور دوسری جگہ ﴿اِذۡ قَالَتِ الۡمَلٰٓئِكَةُ﴾ [آل عمران: 45:3] ''جب فرشتوں نے کہا'' اسی کا مؤید ہے اور وحی جبریل انبیاء سے مخصوص بھی ہے۔ پس مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنا کلام یا الہام اس کی طرف بھیجا اور ﴿فَتَمَثَّلَ لَهَا﴾ میں ضمیر اپنے اوپر ہوگی یعنی اس کلام الٰہی کے آنے کی تفصیل یہ ہے کہ ایک متمثل ہونے والا بشر کی صورت متمثل ہوا۔ یعنی ایک کشفی نگاہ میں اسے ایک بشر نظر آیا۔

1985 - **کشف یا رؤیا میں برے کام کا ارتکاب:** اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جس کے خیالات نیک ہوں وہ رؤیا یا کشف کی حالت میں بھی برے کام کا ارتکاب نہیں کرتا، یہ حضرت مریم علیہا السلام کے خیالات کے کمال عصمت پر دلیل ہے۔ ﴿اِنۡ كُنۡتَ تَقِیًّا﴾ اس لیے بڑھایا کہ متقی ہی ان کی اس بات کی پروا کر سکتا تھا، ایک شریر کیا پروا کرتا۔

1986 - لِاَهَبَ میں فاعل وہ انسان کی صورت نہیں جس کی وساطت سے کلام ہو رہا ہے۔ بلکہ خود اللہ تعالیٰ ہے چنانچہ دوسری قراءت اس کی لِيَهَبَ ہے جو اس معنی کی صحت کی مؤید ہے۔ اور اس ترکیب کے اختیار کرنے کی وجہ یہ ہے کہ جب اس متمثل نے یہ کہا کہ میں تیرے رب کا بھیجا ہوا ہوں۔ تو اب اس پیغام کو بھی ظاہر کیا جو وہ لے کر آیا تھا اور وہ اللہ تعالیٰ کے یہ الفاظ تھے کہ میں تجھے ایک لڑکا دوں گا۔ اور یہ اس کے مطابق ہے جو فرمایا ﴿اِنَّ اللّٰهَ يُبَشِّرُكَ﴾ [آل عمران: 45:3] ''اللہ تجھے خوش خبری دیتا ہے۔''

1987 - ﴿بَغِیًّا﴾ - بَغْیٌ کے لیے [دیکھو نمبر: 115] وغیرہ۔ اور [بَغَتِ الْاَمَةُ] کے معنی ہیں لونڈی نے زنا کیا اور اسی سے بَغِیّ ہے یعنی زنا کرنے والی لونڈی۔ اور اسی سے بِغَآءٌ ہے جو لونڈیوں کی زنا کاری پر قرآن شریف میں آیا ہے ﴿وَ لَا تُكۡرِهُوۡا فَتَيٰتِكُمۡ عَلَى الۡبِغَآءِ﴾ [النور: 33:24] ''اور اپنی لونڈیوں کو بدکاری پر مجبور نہ کرو۔'' اور بعض نے کہا ہے کہ بَغِیٌّ صرف لونڈی ہے بدکار ہو یا نہ ہو۔ اور بعض نے کہا بَغِیٌّ ہر ایک بدکار عورت ہے، لونڈی ہو یا آزاد۔ اور بَغِیٌّ لونڈی کو کہہ دیا جاتا ہے گو اس میں ذم مراد نہ

قَالَ كَذٰلِكِ ۚ قَالَ رَبُّكِ هُوَ عَلَيَّ هَيِّنٌ ۚ وَ لِنَجْعَلَهٗۤ اٰيَةً لِّلنَّاسِ وَ رَحْمَةً مِّنَّا ۚ وَ كَانَ اَمْرًا مَّقْضِيًّا ﴿۲۱﴾

اس نے کہا ایسا ہی ہوگا تیرا رب کہتا ہے یہ مجھ پر آسان ہے اور تاکہ ہم اسے لوگوں کے لیے نشان اور اپنی طرف سے رحمت بنائیں اور یہ امر فیصلہ شدہ ہے۔ (1988)

ہوں۔(ل)

﴿لَمْ يَمْسَسْنِيْ بَشَرٌ﴾ پر [دیکھو نمبر: 427] اور ﴿لَمْ اَكُ بَغِيًّا﴾ نکاح کے مقابل پر بڑھایا۔ کیونکہ مس بشر کنایہ ہے اس سے کہ نکاح ہوا ہو۔

حضرت مریمؑ کی منگنی:

البتہ انجیل سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت آپ کی منگنی ہو چکی تھی:

''چھٹے مہینے جبریل فرشتہ خدا کی طرف سے گلیل کے ایک شہر میں جس کا نام ناصرہ تھا ایک کنواری کے پاس بھیجا گیا جس کی منگنی داؤد کے گھرانے کے ایک مرد یوسف نام سے ہوئی تھی اور اس کنواری کا نام مریم تھا۔''

[لوقا: 1:26, 27]

حضرت مریم کا یہ کہنا کہ مجھے ابھی بشر نے نہیں چھوا خود یہی ظاہر کرتا ہے کہ نکاح کا معاملہ طے ہو چکا تھا تو جب بیٹے کی خوشخبری ملتی ہے تو وہ متعجب ہو کر کہتی ہیں کہ ابھی تو نکاح نہیں ہوا اور بشر نے مجھے چھوا نہیں اور یہ بھی نہیں کہ نکاح کے بغیر میرا تعلق کسی مرد سے ہو گیا ہو۔ کیونکہ میں بدکار عورت نہیں۔ ﴿هُوَ عَلَيَّ هَيِّنٌ﴾ میں بظاہر یہی مراد ہے کہ اس روک کا دور ہونا کیا مشکل ہے۔

1988- **حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے آیت ہونے سے مراد:** ﴿اٰيَةً لِّلنَّاسِ﴾ اٰيَةً کے معنی کے لیے [دیکھو نمبر: 60] ہر چیز جو بطور ایک دلیل یا نشان کے ہو اٰيَةٌ کہلاتی ہے ﴿وَ جَعَلْنَا الَّيْلَ وَ النَّهَارَ اٰيَتَيْنِ﴾ [بنی إسرائیل: 12:17] ''اور ہم نے رات اور دن کو دو نشانیاں بنایا۔'' حالانکہ دن رات معمولی طور پر آتے جاتے ہیں۔ ہر خدا کی طرف بلانے والے کا وجود ایک آیت ہے حق کی مخالفت کرنے والوں کی ہلاکت بھی ایک آیت ہے۔ یوسف اور اس کے بھائیوں کا معاملہ بھی ایک آیت ہے ﴿لَقَدْ كَانَ فِيْ يُوْسُفَ وَ اِخْوَتِهٖۤ اٰيٰتٌ لِّلسَّآئِلِيْنَ ۝﴾ [یوسف: 7:12] ''بے شک یوسف اور اس کے بھائیوں (کے ذکر) میں پوچھنے والوں کے لیے نشان ہیں۔'' بلکہ کئی آیات ہیں۔ اس لیے کہ اس ذکر سے بہت سے سبق ملتے ہیں۔ اور حدیث میں سورج گرہن کو آيَةٌ کہا ہے اور درحقیقت اللہ تعالیٰ کی سب مخلوق ہی نشان ہے ﴿وَ كَاَيِّنْ مِّنْ اٰيَةٍ فِي السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ﴾ [یوسف: 105:12] ''اور آسمانوں اور زمین میں کتنے نشان ہیں۔'' حضرت مسیح کس معنی میں آیت تھے؟ یہاں آپ کو ﴿اٰيَةً لِّلنَّاسِ﴾ کہا ہے۔ اگر صرف اعجازی ولادت میں نشان مراد ہو تو صرف مومنوں کے لیے نشان ہوتے نہ عام طور پر لوگوں کے لیے۔ ہوسکتا ہے کہ اٰيَةٌ میں یہاں ان کی رسالت کی طرف اشارہ ہو۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کا نبی بلکہ اس کے صالح بندے بھی اس کے وجود پر ایک آیت بن جاتے ہیں۔ یا

فَحَمَلَتۡهُ فَانۡتَبَذَتۡ بِهٖ مَكَانًا قَصِيًّا ﴿۲۲﴾ پھر (مریم نے) اسے حمل میں لیا اور اس کے ساتھ الگ ہو کر وہ چلی گئی۔ (1989)

خصوصیت سے مراد یہ ہو کہ ان کے بعد نبوت بنی اسرائیل سے منقطع ہو گئی۔ مگر پہلے معنی کی ﴿رَحۡمَةً مِّنَّا﴾ سے تائید ہوتی ہے۔

1989 - **حضرت مریم علیہا السلام کا حاملہ ہونا الوہیت مسیح کے خلاف دلیل ہے:** اس آیت میں مریم صدیقہ کے عیسیٰ کو حمل میں لینے کا ذکر کیا۔ اس ذکر کی ضرورت سوائے اس کے کچھ نہیں کہ تا یہ بھی عیسائیت کے عقیدہ الوہیت مسیح کے خلاف دلیل ہو اور ایسی ہی دلیل کے طور پر خود نبی کریم ﷺ نے وفد نجران کے سامنے اسے استعمال کیا۔ کیونکہ وہ چیز جسے عورت حمل میں لیتی ہے وہ خدا نہیں ہو سکتا۔ اور شاید اس لیے بھی حمل کا ذکر ہو کہ تا معلوم ہو کہ جس طرح پر عورتوں کو حمل ہوتا ہے اسی طرح حضرت مریم کو بھی ہوا۔ اور نبی کریم ﷺ نے وفد نجران کے مقابل پر ایسا ہی فرمایا [أَلَسْتُمْ تَعْلَمُونَ أَنَّ عِيسَى حَمَلَتْهُ أُمُّهُ كَمَا تَحْمِلُ الْمَرْأَةُ] (ابن اسحاق فی السیرة، جلد2، صفحہ 45-46؛ الطبري في التفسير، جلد6، صفحہ 151-153) کیا تم نہیں جانتے کہ عیسیٰ کو اس کی ماں نے حمل میں لیا، جس طرح عورتیں حمل میں لیا کرتی ہیں۔ [كَمَا تَحْمِلُ الْمَرْأَةُ] کے لفظ فیصلہ کن ہیں کہ یہ حمل اسی طریق پر ہوا جس طرح عورتوں کو ہوا کرتا ہے اور یہ بھی ظاہر ہے کہ اسے مریم کے کشف اور فرشتہ کے کلام سے بالکل الگ کر کے بیان کیا ہے اور یہ اس سے بھی ظاہر ہے کہ خود مفسرین نے ایسے اقوال نقل کیے ہیں جیسے وہب کا قول [إِنَّ مَرْيَمَ لَمَّا حَمَلَتْ كَانَ مَعَهَا اِبْنِ عَمٍّ لَهَا يُسَمّٰى يُوْسُفَ النَّجَّارِ] (روح المعانی، جلد16، صفحہ 80) (یعنی جب مریم کو حمل ہوا تو ان کے ساتھ ان کے چچا کا بیٹا یوسف نجار تھا)۔ (د) اور یہ یوسف نجار وہی ہیں جو بروئے اناجیل و تاریخ حضرت مریم کے شوہر تھے اور جن کے ساتھ مریم کا تعلق زوجیت یعنی میاں بی بی کا تعلق ہونا خود عیسائیوں کو مسلم ہے۔ جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو خدا بناتے ہیں۔ مگر مسلمان بعض یہاں تک گئے ہیں کہ کہتے ہیں حضرت مریم علیہا السلام کو حیض بھی نہیں آتا تھا اور کبھی کہہ دیتے ہیں کہ مریم کا حمل صرف ایک گھڑی کے لیے تھا یعنی فوراً حمل ہوا، فوراً آپ وہاں سے چل پڑیں اور فوراً حضرت عیسیٰ علیہ السلام پیدا ہو گئے (اور اس کے آگے ایک مرحلہ اور ترقی کر کے یہ بھی کہ وہ فوراً نبی بھی بن گئے) حالانکہ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے کہ حضرت مریم علیہا السلام کو نو ماہ حمل رہا۔ جس طرح تمام عورتوں کو حمل رہتا ہے۔ (ر)

مَكَانًا قَصِيًّا سے مراد اور حضرت مریم کا سفر بیت لحم:

﴿فَانۡتَبَذَتۡ بِهٖ مَكَانًا قَصِيًّا ﴿۲۲﴾﴾ سے یہ مراد نہیں کہ حمل ہوتے ہی وہ کسی دور کے مکان میں چلی گئی۔ بلکہ مطلب صرف اس قدر ہے کہ حالت حمل میں اسے کہیں دور جانا پڑا۔ اور بہ کا لفظ ساتھ بڑھانے کا منشا سوائے اس کے کچھ نہیں ہو سکتا کہ وہ وقت ایسا تھا کہ حمل کا اچھا بوجھ محسوس ہوتا تھا۔ یہ انجیل سے معلوم ہوتا ہے کہ وضع حمل کا وقت قریب تھا اور یہ سفر مردم شماری کی غرض کے لیے یوسف نے مریم کے ساتھ اختیار کیا تھا۔

''یہ پہلی اسم نویسی سوریہ کے حاکم کورنیس کے عہد میں ہوئی اور سب لوگ نام لکھوانے کے لیے اپنے اپنے شہر کو گئے۔

فَاَجَآءَهَا الۡمَخَاضُ اِلٰى جِذۡعِ النَّخۡلَةِ ۚ قَالَتۡ يٰلَيۡتَنِىۡ مِتُّ قَبۡلَ هٰذَا وَ كُنۡتُ نَسۡيًا مَّنۡسِيًّا ﴿۲۳﴾

پھر دردزہ اسے کھجور کے تنے کی طرف لے آیا، کہنے لگی اے کاش میں اس سے پہلے مرجاتی اور بھولی بسری ہوتی۔ (1990)

پس یوسف بھی گلیل کے شہر ناصرہ سے داؤد کے شہر بیت لحم کو گیا جو یہودیہ میں ہے۔ اس لیے کہ وہ داؤد کے گھرانے اور اولاد سے تھا اور اپنی مریم منگیتر کے ساتھ جو حاملہ تھی نام لکھوائے۔ جب وہ وہاں تھے تو ایسا ہوا کہ اس کے جننے کا وقت آ پہنچا۔'' [لوقا: 2:2-6]

1990 - جَآءَ (یَجِیۡءُ) کے معنی وہی ہیں جو اَتٰی کے، یعنی آیا۔ لیکن اِتْیَانَ سہولت کی مَجِیۡءَ ہے یعنی سہولت سے آنا اور اتیان یا اَتٰی قصد کے اعتبار سے کہا جاتا ہے گو وہ مقصد حاصل نہ ہوا ہو اور مَجِیۡءَ یا جَآءَ حصول اعتبار سے اور اعیان اور معانی دونوں پر مشتمل ہوتا ہے ﴿وَ جَآءَ مِنۡ اَقۡصَا الۡمَدِيۡنَةِ﴾ [یٰسٓ: 20:36] ''اور شہر کے پرلے کنارے سے آیا۔'' ﴿فَاِذَا جَآءَ الۡخَوۡفُ﴾ [الأحزاب: 19:33] ''پھر جب خوف آتا ہے۔'' ﴿فَاِذَا جَآءَ اَجَلُهُمۡ﴾ [الأعراف: 34:7] ''پھر جب ان کی میعاد آ پہنچتی ہے۔'' اور ﴿فَقَدۡ جَآءُوۡ ظُلۡمًا وَّ زُوۡرًا﴾ [الفرقان: 4:25] میں مراد ہے کہ ظلم اور جھوٹ کا قصد کیا اور اسے کر گزرے۔ اور ﴿وَّ جَآءَ رَبُّكَ وَ الۡمَلَكُ صَفًّا صَفًّا﴾ [الفجر: 22:89] ''اور تیرا رب آئے گا اور فرشتے قطاروں کی قطاریں۔'' میں بالذات آنا مراد نہیں بلکہ اپنے امر کے ساتھ آنا مراد ہے۔ اور یہ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے۔ اور اَجَآءَ، جَآءَ سے متعدی کیا گیا ہے اور اس کے معنی اَلْجَأَ ہیں یعنی اسے ایک بات کے لیے مضطر کر دیا اور [جَآءَ بِكَذَا] کے معنی ہیں اسے حاضر کیا ﴿لَوۡلَا جَآءُوۡ عَلَيۡهِ بِاَرۡبَعَةِ شُهَدَآءَ﴾ [النور: 13:24] ''کیوں نہ اس پر چار گواہ لائے۔'' (غ)

مَخَاضُ - اس کا اصل مَخَضٌ ہے اور مَخَاضٌ دردزہ کو کہتے ہیں یعنی حاملہ کو جننے کے وقت جو درد ہوتا ہے۔ (ل)

جِذۡعِ - جِذۡعٌ کھجور کے تنا کو بھی کہتے ہیں اور شاخ کو بھی۔ (ل) ﴿فِىۡ جُذُوۡعِ النَّخۡلِ﴾ [طٰہٰ: 71:20] ''کھجوروں کے تنوں میں۔''

حضرت مریم کا دردزہ ابطال الوہیت مسیح ہے:

حضرت مریم علیہا السلام کے حمل کے ذکر کے بعد اب دردزہ کا ذکر کیا ہے اور جس طرح ذکر حمل عیسائیت پر اتمام حجت کے لیے ہے اسی طرح دردزہ کا ذکر بھی ہے۔ کیونکہ عیسائی کہتے ہیں کہ آدم کے گناہ کی وجہ سے عورت کو یہ سزا ملی تھی کہ ''درد سے تو لڑکے جنے گی۔'' [پیدائش: 16:3] اور جسے عیسائی اپنا خدا سمجھتے ہیں جس نے آدم کے گناہ کا ازالہ کرنا تھا جب وہ جنا جاتا ہے تو اس کی ماں بھی دردزہ سے جنتی ہے اور یہاں تک شدت دردزہ کی ہوتی ہے کہ وہ چلا اٹھتی ہے ﴿يٰلَيۡتَنِىۡ مِتُّ قَبۡلَ هٰذَا﴾۔ بعض مفسرین کا خیال ہے کہ حضرت مریم کی طرف اس بات کو منسوب کرنا کہ انہوں نے دردزہ کی شدت سے ایسا کہا ہو ان کی شان کے لائق

فَنَادٰىهَا مِنۡ تَحۡتِهَاۤ اَلَّا تَحۡزَنِىۡ قَدۡ جَعَلَ رَبُّكِ تَحۡتَكِ سَرِيًّا ﴿۲۴﴾

تو اس کے نیچے سے اسے ایک ندا آئی کہ غم نہ کرے تیرے رب نے تیرے نیچے ایک چشمہ (بہا) رکھا ہے۔ (1991)

وَ هُزِّىۡۤ اِلَيۡكِ بِجِذۡعِ النَّخۡلَةِ تُسٰقِطۡ عَلَيۡكِ رُطَبًا جَنِيًّا ﴿۲۵﴾

اور کھجور کے تنے کو اپنی طرف ہلا، تجھ پر تازہ پکی کھجوریں جھڑ پڑیں گے۔ (1992)

نہیں۔ وہ یہ نہیں سوچتے کہ بڑی سے بڑی عورت کی شان بھی اسے اس تکلیف سے نہیں بچا سکتی۔ اور اگر کسی رسوائی کے خیال سے حضرت مریم یہ بات کہہ سکتی ہیں تو دردزہ کی شدت سے کیوں نہیں کہہ سکتیں۔ پھر یہ پلوٹھی کا بچہ تھا اور پہلے وضع حمل میں عورت کو ہمیشہ بہت زیادہ تکلیف ہوتی ہے۔ علاوہ ازیں مشکلات تھیں کہ گھر میں نہ تھیں، حالت سفر میں تھیں، بے سروسامانی حد درجہ کی، یہاں تک کہ باہر کھلے میدان میں یہ واقعہ پیش آیا۔ جس پر قرآن کریم و انجیل دونوں شاہد ہیں، دائی تک پاس نہیں، ایسی حالت میں شدت دردزہ سے ان الفاظ کا ان کے منہ پر آجانا بالکل قرین قیاس ہے۔

کھجور کے تنے سے سہارے کے لیے مضطر ہو جانا بھی انجیل کے بیان سے ملتا جلتا ہے:

''اور وہ پہلوٹا بیٹا جنی اور اس کو کپڑے میں لپیٹ کر چرنی میں رکھا کیونکہ ان کے واسطے سرائے میں جگہ نہ تھی۔''

[لوقا: 7:2]

اور یہ بالکل قرین قیاس ہے کہ سرائے کے باہر کسی کھجور کے درخت سے سہارا لیا ہے اور اس کا ذکر قرآن شریف نے اس لیے کیا کہ جسے عیسائی خدا خدا کر کے پکارتے ہیں وہ کیسی بے کسی کی حالت میں پیدا ہوا اور جسے خدا کی ماں کہہ دیا جاتا ہے اس نے کس مصیبت کی حالت میں اسے جنا۔

1991 - سَرِیّ - سَرَیٌ رات کو چلا اور یہ سَرَاۃ سے ہے جو فراخ زمین کو کہتے ہیں۔ اور سَرِیّ نہر ہے جو چلتی ہے۔ (غ)

نَادٰىهَا کا فاعل نہیں بتایا۔ ظاہر ہے کہ خدا کا فرشتہ ہے اور یہ الہامی آواز ہے۔ مگر بعض مفسرین کو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے جلد بلانے کا شوق یہاں تک ہے کہ کہتے ہیں یہ آواز حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے پیدا ہوتے ہی دی تھی۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق عجوبہ پرستی کسی زمانہ میں لوگوں کے رگ وریشہ میں سرایت کر گئی تھی۔

1992 - ﴿هُزِّىۡ﴾ - هَزٌّ زور سے ہلانا ہے۔ اسی سے اِهۡتَزَّ ہے ﴿فَلَمَّا رَاٰهَا تَهۡتَزُّ﴾ [النمل: 10:27] ''سو جب اسے ہلتا ہوا دیکھا۔'' اور سبزی کا اپنی تروتازگی سے حرکت کرنا بھی اِهۡتِزَازٌ ہے

رُطَب - رَطب تازہ، یَابَس (یعنی خشک) کے خلاف اور رُطَب تازہ کھجور سے مخصوص ہے۔ (غ)

فَكُلِىۡ وَ اشۡرَبِىۡ وَ قَرِّىۡ عَيۡنًا‌ ۚ فَاِمَّا تَرَيِنَّ مِنَ الۡبَشَرِ اَحَدًا‌ ۙ فَقُوۡلِىۡۤ اِنِّىۡ نَذَرۡتُ لِلرَّحۡمٰنِ صَوۡمًا فَلَنۡ اُكَلِّمَ الۡيَوۡمَ اِنۡسِيًّا ۚ﴿۲۶﴾

سوکھا اور پی اور آنکھیں ٹھنڈی کر پھر اگر تو کسی انسان کو دیکھے تو کہنا میں نے رحمٰن کے لیے (اپنے اوپر) روزہ واجب کیا ہے۔ اس لیے آج میں کسی انسان سے کلام نہیں کروں گی۔ (1993)

جَنِيّ - جَنَى پھل کے چننے پر بولا جاتا ہے اور جَنِيّ وہ ہے جو چنا گیا مگر اس کا استعمال تازہ پھل پر ہے اور جَنَى پھل ہے ﴿وَجَنَا الْجَنَّتَيْنِ دَانٍ﴾ [الرحمٰن: 54:55] ''اور دونوں باغوں کے پھل قریب ہیں۔'' اور استعارۃً جِنَايَةٌ کا استعمال گناہ پر ہوتا ہے۔ (غ)

کھانے اور پینے دونوں کا سامان موجود تھا۔ کھجور موجود تھی۔ اس کے ہلانے سے تازہ کھجوریں مل جائیں گی اور پانی کا چشمہ نیچے بہہ رہا تھا۔ اس کا پتہ بتا دیا۔ اگر ایک طرف بے کسی کا اظہار کیا تو دوسری طرف یہ بھی بتا دیا کہ کس طرح جنگل میں بھی اللہ تعالیٰ اپنی نعمتیں مہیا فرما دیتا ہے۔

1993 - ﴿قَرِّىۡ عَيۡنًا﴾ [دیکھو نمبر: 96] قَرَّتْ عَيْنُهٗ کے معنی ہیں سُرَّت یعنی آنکھ کو راحت پہنچی اور یا یہ قُرّ بمعنی سردی سے ہے یعنی آنکھ ٹھنڈی ہوئی اور یا یہ قَرَارٌ سے ہے یعنی آنکھ کو اس سے سکون ملا۔ پس وہ دوسری چیز کی طرف نہ اٹھی۔ ﴿قُرَّتُ عَيْنٍ﴾ [القصص: 9:28] ''آنکھ کی ٹھنڈک۔'' ﴿قُرَّةَ اَعْيُنٍ﴾ [الفرقان: 74:25] ''آنکھوں کی ٹھنڈک۔'' ﴿كَىْ تَقَرَّ عَيْنُهَا﴾ [طٰهٰ: 40:20] ''تا کہ اس کی آنکھ ٹھنڈی رہے۔'' (غ)

مریمؑ کے کسی سے کلام نہ کرنے کی غرض:

کھانے پینے کا سامان سفر میں بہم پہنچایا۔ آنکھوں کو راحت کے لیے بیٹا عطا فرمایا۔ اس لیے ساتھ ہی اپنی نعمت کی شکر گزاری کے لیے لوگوں سے بات چیت بند کر کے اللہ کے ذکر کی طرف توجہ دلائی۔ جس طرح زکریا کو فرمایا تھا ﴿اَلَّا تُكَلِّمَ النَّاسَ ثَلٰثَةَ اَيَّامٍ اِلَّا رَمۡزًا‌ ؕ وَاذۡكُرۡ رَّبَّكَ كَثِيۡرًا وَّسَبِّحۡ بِالۡعَشِىِّ وَالۡاِبۡكَارِ﴾ [آل عمران: 41:3] ''تین دن سوائے اشارہ کے لوگوں سے بات نہ کرے اور اپنے رب کو بہت یاد کر اور شام اور صبح تسبیح کر۔'' یعنی تین یوم کی خاموشی سے فائدہ یہ اٹھاؤ کہ اللہ تعالیٰ کا ذکر اور تسبیح بہت کرو جو ایک نعمت پر شکر گزاری کے طور پر ہے۔ حالانکہ دوسرے موقعہ پر جب اس سورت میں تین دن کی خاموشی کا ذکر کیا تو وہاں کوئی ایسے لفظ نہیں۔ مگر مراد وہی ہے۔ اسی طرح حضرت مریم علیہا السلام کے ذکر میں خاموشی کی ہدایت فرما کر اس ذکر کی ضرورت نہ تھی کہ اس اثنا میں ذکر خدا کرو۔ مگر مطلب یہی ہے اور یہ کہنا کہ اس سے مطلب یہ تھا کہ لوگ تم پر الزام لگائیں گے تو تم جواب نہ دے سکو گی۔ اس لیے خاموش رہو، درست نہیں۔ اس لیے کہ یہ تو حالت سفر تھی۔ سرائے کے باہر پڑے تھے، اندر بھی جگہ نہ ملی تھی۔ وہاں کون جانتا تھا کہ یہ مریم کون ہے اور اس نے بچہ بن باپ کے جنا ہے۔ قرآن کریم کے

فَاَتَتۡ بِهٖ قَوۡمَهَا تَحۡمِلُهٗ ؕ قَالُوۡا يٰمَرۡيَمُ لَقَدۡ جِئۡتِ شَيۡـًٔا فَرِيًّا ﴿۲۷﴾

پھر اسے سوار کیے ہوئے اپنے قوم کے پاس آئی۔ انہوں نے کہا اے مریم تو ایک عجیب چیز لائی ہے۔ (1994)

پُرحکمت الفاظ پر بھی غور نہیں کیا۔ ﴿مِنَ الۡبَشَرِ اَحَدًا﴾ صاف بتاتا ہے کہ کسی انسان سے بھی کلام نہیں کرنا۔ یہاں تک کہ یوسف سے بھی نہیں کیونکہ وہ بھی بشر میں داخل ہے۔

خاموشی کا روزہ شریعت نے منسوخ کر دیا:

یہ خاموشی کا روزہ صرف ذکر الٰہی کے لیے تھا اور یہودی ایسا کرتے تھے کہ ذکر الٰہی کے لیے خاموشی کا روزہ رکھتے تھے۔ اسلام نے اس کی اجازت نہیں دی اور نبی کریم ﷺ نے اسے منع کر دیا۔ (ر) اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ ایک عورت پر داخل ہوئے جس نے نذر مانی تھی کہ کلام نہ کرے گی۔ تو آپ نے فرمایا کہ اسلام نے اسے منسوخ کر دیا ہے۔ (ر) ہاں اس قصہ سے اس قدر سبق ہر مسلمان کو اب بھی ملتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں پر کس طرح شکر گزاری کرے۔

1994 - ﴿تَحۡمِلُهٗ﴾ سے مراد گود میں اٹھانا ہی نہیں بلکہ سواری دینا بھی ہے۔ [دیکھو نمبر: 1335] یا سواری کرنا۔

فریّ - فَرَی کے معنی ہیں قطع کیا۔ [دیکھو نمبر: 395] اور فَرِیّ کے معنی عظیم، عجیب اور بناوٹی ہیں۔ (غ)

حضرت عیسیٰؑ کے زمانہ نبوت کے حالات:

مفسرین کا خیال تو یہ ہے کہ حضرت مریم حاملہ ہو جانے پر اپنے رشتہ داروں سے بھاگ گئی تھیں۔ لیکن ساتھ ہی یہ بھی کہتے ہیں کہ بچہ جنتے ہی پھر اسے گود میں لیے قوم کے پاس پہنچیں۔ یہ دونوں باتیں ایک دوسرے کے خلاف ہیں۔ اگر وہ اس خوف سے بھاگتیں کہ لوگ مجھ پر الزام لگائیں گے تو پھر بچہ کو اٹھائے ہوئے آنے کے کیا معنی؟ اور اگر یہ کہا جائے کہ پھر انہیں یقین ہو گیا کہ یہ بچہ خود الزام کا جواب دے لے گا تو یہ اس تفسیر کے مطابق پہلے سے علم تھا ﴿وَ يُكَلِّمُ النَّاسَ فِي الۡمَهۡدِ﴾۔ اس لیے یہ قصہ بنانا پڑا کہ شیطان نے یہودیوں کو خبر دے دی تھی کہ مریم کے ہاں لڑکا ہوا ہے۔ اس لیے انہوں نے اسے بلا بھیجا۔ اصل بات یہ ہے کہ یہ واقعہ بالکل الگ ہے اور حضرت عیسیٰ کی ولادت کے ساتھ اس ذکر کو چھوڑ دیا ہے۔ یہاں تک کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی نبوت کا زمانہ آ جاتا ہے۔ اور یہ بالکل اس کے مطابق ہے جو پچھلے رکوع میں حضرت یحییٰ کے ذکر میں طرز اختیار فرمائی تھی۔ یعنی بشارت دے کر اور اس پر تسبیح کا ارشاد کر کے فوراً فرمایا ﴿يٰيَحۡيٰى خُذِ الۡكِتٰبَ بِقُوَّةٍ﴾ حالانکہ یحییٰ کے پیدا ہونے کا بھی ذکر نہیں کیا تھا۔ یہاں ولادت کے ذکر کے بعد حضرت مریم کو ذکر و تسبیح کا ارشاد کر کے اسی طرح حضرت عیسیٰ کے زمانہ نبوت کا ذکر کیا ہے۔ اور پچھلی آیت کا تعلق اس مضمون سے کوئی نہیں۔ اور اس پر قطعی دلیل یہ ہے کہ اس موقع پر جو کچھ حضرت مریم کو کہا گیا اور اس کا جو جواب حضرت عیسیٰ نے دیا وہ یقیناً اور قطعاً زمانہ نبوت سے تعلق رکھتا ہے۔ کیونکہ حضرت عیسیٰ کہتے ہیں کہ ﴿وَ جَعَلَنِىۡ نَبِيًّا﴾۔ اللہ تعالیٰ نے مجھے نبی بنایا ہے اور یہ بھی فرماتے ہیں کہ ﴿اٰتٰنِىَ الۡكِتٰبَ﴾ مجھے کتاب دی ہے۔ اور یہ کہنا کہ یہ باتیں لامحالہ واقع ہونے والے ہونے کی وجہ سے ماضی کے صیغہ میں بیان کی گئی ہیں اور مراد استقبال ہے تو ﴿وَ اَوۡصٰنِىۡ بِالصَّلٰوةِ وَ

يٰۤاُخۡتَ هٰرُوۡنَ مَا كَانَ اَبُوۡكِ امۡرَاَ سَوۡءٍ اے ہارون کی بہن! تیرا باپ بُرا آدمی نہیں تھا

الزَّكٰوةِ مَا دُمۡتُ حَيًّا﴾ کے کس طرح معنی کیے جائیں گے۔ اور وہ مجھے نماز اور زکوٰۃ ادا کرنے کا حکم دے گا جب تک میں زندہ رہوں۔ گویا جب کلام کر رہے ہیں اس وقت ﴿مَا دُمۡتُ حَيًّا﴾ میں داخل نہ تھے اور ﴿لَمۡ يَجۡعَلۡنِىۡ﴾ کے معنی کس طرح کریں گے۔ یہ سب ماضی کے صیغے ہیں یا تو ان سب کے معنی مستقبل کے ہوں گے اور وہ ہو نہیں سکتے۔ کیونکہ پھر لازم آتا ہے کہ کلام کرنے کے وقت حضرت عیسیٰ زندہ نہ ہوں۔ اور یہ بھی نہیں ہوسکتا کہ بعض مستقبل کے صیغے مانے جائیں اور بعض ماضی کے۔ کیونکہ اس صورت میں ایک دن یا چالیس دن کے بچے کو نماز اور زکوٰۃ کا حکم ملنا بے معنی ہے۔ پھر کیا حضرت عیسیٰ ایک ماہ کی عمر میں ماشاء اللہ نمازی اور تہجد خواں بھی تھے اور کسی مال کے مالک بھی تھے؟ اور یا ماننا پڑے گا کہ اس کلام کے کرتے وقت حضرت مسیح نبی بن چکے تھے۔ انجیل ان پر نازل ہو رہی تھی، نماز اور زکوٰۃ کا حکم مل چکا تھا اور ان پر یہ الزام تھے کہ یہ خدائی کا دعویٰ کرتا ہے۔ جس کا جواب ﴿اِنِّىۡ عَبۡدُ اللّٰهِ﴾ میں ہے اور یہ کہ ماں سے بھی اچھا سلوک نہیں کرتا (اور یہ واقعہ اناجیل میں بھی موجود ہے) جس کا جواب ﴿بَرًّا ۢ بِوَالِدَتِىۡ﴾ میں ہے اور یہ کہ یہ ایک سرکش آدمی ہے جو علماء اور گدی نشینوں کو برا کہتا ہے جس کا جواب ﴿لَمۡ يَجۡعَلۡنِىۡ جَبَّارًا شَقِيًّا﴾ میں ہے، اور س کے سوائے چارہ نہیں۔ پس ﴿فَاَتَتۡ بِهٖ قَوۡمَهَا تَحۡمِلُهٗ﴾ لازماً حضرت عیسیٰ کے زمانہ نبوت سے تعلق رکھتا ہے اور حضرت عیسیٰ اس وقت حضرت مریم کی گود میں نہ تھے بلکہ سوار ہو کر یروشلم میں داخل ہوئے تھے۔ اور سوار ہو کر داخل ہونا کسی خاص غرض سے تھا۔ جیسا کہ انجیل میں ہے [دیکھو متی: 21] باب جس میں حضرت مسیح کے یروشلم پہنچنے کا اور گدھی یا گدھی کے بچے یا دونوں پر سوار ہونے کا ذکر ہے ''اور گدھی اور بچے کو لا کر اپنے کپڑے ان پر ڈالے اور وہ ان پر بیٹھ گیا۔'' [متی: 7:21] ''اور یہ اس لیے ہوا کہ جو نبی کی معرفت کہا گیا تھا وہ پورا ہو۔'' [متی: 4:21] اور حضرت مریم کا ساتھ ہونا اس لیے بیان کیا کہ اناجیل کے بعض بیانات سے پایا جاتا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی والدہ اور ان کے بھائی گویا ان پر ایمان نہ لاتے تھے۔ تو والدہ کے ساتھ ہونے کو اس کی تردید کے لیے بیان کیا ہے۔ کیونکہ اگر فی الواقع یہ سچ ہے کہ حضرت مریم بھی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو جھوٹا جانتی تھیں تو پھر آپ کی نبوت پر اور خود حضرت مریم علیہا السلام کے صدیقہ ہونے پر سخت شبہات وارد ہوتے ہیں اور اناجیل کے ہی کئی موقعوں سے ظاہر ہے کہ حضرت مریم حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ساتھ رہتی تھیں۔

﴿شَيۡـًٔا فَرِيًّا﴾ سے مراد:

اور فقیہوں وغیرہ کا یہ کہنا کہ اے مریم تو ایک بناوٹ بنا لائی ہے یا تو ایک عجیب چیز لائی ہے، اسی طرف اشارہ ہے۔ اس لیے کہ ایک طرف ان کے نزدیک خدائی کا دعویٰ ہے، دوسری طرف حضرت مسیح نے اپنے وعظوں میں اپنی قوم کے علماء کے ساتھ سختی بھی کی تھی اور ایسے الفاظ میں انہیں خطاب کیا تھا: ''اے سانپ کے بچو! تم برے ہو کر کیونکر اچھی باتیں کہہ سکتے ہو۔'' [متی: 12:34]

''اے ریاکار فقیہو اور فریسیو تم پر افسوس ہے کہ تم سفیدی پھری ہوئی قبروں کی مانند ہو، جو اوپر سے تو خوبصورت دکھائی دیتی ہیں مگر اندر مردوں کی ہڈیوں اور ہر طرح کی نجاست سے بھری ہوئی ہیں۔ اسی طرح تم بھی ظاہر میں تو

وَّ مَا كَانَتۡ اُمُّكِ بَغِيًّا ﴿۲۸﴾

اور نہ تیری ماں بدکار تھی۔ (1995)

فَاَشَارَتۡ اِلَيۡهِ ؕ قَالُوۡا كَيۡفَ نُكَلِّمُ مَنۡ كَانَ فِى الۡمَهۡدِ صَبِيًّا ﴿۲۹﴾

تو اس نے اس کی طرف اشارہ کیا۔ انہوں نے کہا ہم کس طرح اس سے کلام کریں جو (ابھی کل) جھولے میں لڑکا تھا۔ (1996)

لوگوں کو راستباز دکھائی دیتے ہو مگر باطن میں ریاکاری اور بے دینی سے بھرے ہوئے ہو۔'' [متی: 27:23, 28]

''اے سانپو، اے افعی کے بچو۔'' [متی: 23:33]

حضرت مسیح کی عمر اس وقت تیس بتیس سال کی بتائی جاتی ہے۔ اس لیے انہوں نے ان کو نوعمری کی وجہ سے قابل خطاب بھی نہیں سمجھا جیسا کہ آگے ذکر آتا ہے اور ماں سے خطاب کیا۔

1995 - ﴿يٰۤاُخۡتَ هٰرُوۡنَ﴾۔ حضرت مریم کو ان الفاظ میں خطاب کیا ہے۔ [دیکھو نمبر: 407] تعجب ہے کہ عیسائی اعتراض کرتے ہیں جن کی اپنی انجیل میں موجود ہے۔ اے یوسف ابن داؤد۔ اور جہاں بار بار مسیح کو ابن داؤد کہا گیا ہے اور اس خطاب میں ایک گونہ حضرت مریم علیہا السلام کی بزرگی کا اعتراف بھی ہے۔ کیونکہ حضرت ہارون علیہ السلام کی طرف آپ کو نسبت دی گئی۔ [دیکھو نمبر: 305]

یہودیوں کا اعتراض حضرت عیسیٰؑ پر تھا نہ مریمؑ پر:

اور ان کا یہ کہنا کہ تیرا باپ برا نہ تھا اور تیری ماں بدکار نہ تھی یا لونڈی نہ تھی [دیکھو نمبر: 1987] میں بھی اشارہ حضرت مسیح کی طرف ہی ہے کہ یہ ہمیں گالیاں دیتا ہے اور تمہارا خاندان تو اچھا خاندان تھا۔ یہ ایسا کہاں سے پیدا ہو گیا؟ اور اگر یہ کہا جائے کہ یہودیوں نے مریم پر زنا کا بہتان تو باندھا ہے تو کیوں وہی مراد نہ سمجھا جائے۔ تو وہ باندھنے والے پچھلے لوگ ہیں۔ ﴿وَّ قَوۡلِهِمۡ عَلٰى مَرۡيَمَ بُهۡتَانًا عَظِيۡمًا ۙ﴿۱۵۶﴾ وَّ قَوۡلِهِمۡ اِنَّا قَتَلۡنَا الۡمَسِيۡحَ﴾ [النسآء: 4:156-157] ''اور ان کے مریم پر بڑا بہتان باندھنے کی وجہ سے۔ اور ان کے یہ کہنے کی وجہ سے کہ ہم نے مسیح کو قتل کر دیا۔'' پیچھے جب مخالفت حد کو پہنچ گئی تو اس مخالفت کے جوش میں سب کچھ کہہ دیا۔ اور اگر مریم پر جھوٹا الزام بھی دیا ہو تو کیا شادی شدہ عورتوں پر بہتان نہیں باندھے جاتے۔ مگر سیاق سے صاف ظاہر ہے کہ یہاں ذکر زمانہ نبوت حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا ان کے مزعومہ خدائی کے دعویٰ کا اور ان کی مزعومہ سختی کا ہے جو وہ بزرگان قوم پر کرتے ہیں بلکہ خود ماں سے بھی کرتے ہیں۔

1996 - ﴿فَاَشَارَتۡ﴾ [اَشَارَ يَشِيۡرُ] کا مادہ شَوۡرَ ہے [دیکھو نمبر: 302] اور اسی سے شوریٰ ہے۔ حضرت مریم نے بجائے خود جواب دینے کے حضرت مسیح کی طرف اشارہ کیا، یہ خاموشی کے روزہ کی وجہ سے نہ تھا جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا۔ اور یہ خود اس سے بھی ظاہر ہے کہ خاموشی کے روزہ پر یہ حکم تھا ﴿فَقُوۡلِىۡۤ اِنِّىۡ نَذَرۡتُ لِلرَّحۡمٰنِ صَوۡمًا فَلَنۡ اُكَلِّمَ الۡيَوۡمَ اِنۡسِيًّا﴾ یعنی اگر کوئی پوچھے تو اسے بتا دو کہ میں نے خاموشی کا روزہ رکھا ہوا ہے۔ مگر یہاں انہوں نے بتایا کچھ نہیں اور بات بھی یہی معقول تھی۔ اعتراض تو حضرت

قَالَ اِنِّیۡ عَبۡدُ اللّٰهِ ؕ اٰتٰنِیَ الۡکِتٰبَ وَ جَعَلَنِیۡ نَبِیًّا ۙ﴿۳۰﴾

(عیسیٰ نے) کہا میں اللہ کا بندہ ہوں اس نے مجھے کتاب دی اور نبی بنایا۔

وَّ جَعَلَنِیۡ مُبٰرَکًا اَیۡنَ مَا کُنۡتُ ۪ وَ اَوۡصٰنِیۡ بِالصَّلٰوةِ وَ الزَّکٰوةِ مَا دُمۡتُ حَیًّا ۙ﴿۳۱﴾

اور مجھے برکت والا بنایا جہاں کہیں میں رہوں اور مجھے نماز اور زکوٰۃ کا حکم دیا ہے جب تک میں زندہ رہوں۔

وَّ بَرًّۢا بِوَالِدَتِیۡ ۫ وَ لَمۡ یَجۡعَلۡنِیۡ جَبَّارًا شَقِیًّا ۚ﴿۳۲﴾

اور اپنی ماں سے نیکی کرنے والا (ہوں) اور اس نے مجھے سرکش بدبخت نہیں بنایا۔[1997]

مسیح پر تھا، آپ اس کا کیا جواب دیتیں۔ آپ نے ان کی طرف اشارہ کر دیا کہ خود انہی سے دریافت کرو مجھے کیا کہتے ہو۔ تو انہوں نے جواب میں کہا کہ ہم کل کے بچہ سے کیا بات کریں۔ اس کے سوائے ﴿مَنۡ کَانَ فِی الۡمَهۡدِ صَبِیًّا﴾ کے کچھ معنی نہیں بنتے۔ مفسرین نے خود اس مشکل کو محسوس کیا ہے [وَاسْتُشْكِلَتِ الْآيَةِ بِأَنَّ كُلّ مَنْ يُّكَلِّمُهُ النَّاسَ كَانَ فِي الْمَهْدِ صَبِيًّا قَبْلَ زَمَانَ تَكْلِيْمِهِ.] (روح المعانی، جلد16، صفحہ 88) (ر) یعنی اس آیت میں اشکال واقع ہوا ہے۔ اس لیے ہر شخص جس سے لوگ باتیں کرتے ہیں وہ گفتگو کے زمانہ سے پہلے جھولے میں بچہ رہ چکا ہے اور یہ کس قدر ظاہر بات ہے کہ اگر حضرت عیسیٰ علیہ السلام اس کلام کے وقت بچہ ہوتے تو انہیں کہنا چاہئے تھا [كَيْفَ نُكَلِّمُ مَنْ هُوَ فِي الْمَهْدِ صَبِيّ] كَانَ کا استعمال خود بتاتا ہے کہ کلام کرنے والا اس حالت سے نکل چکا ہے۔ رہا یہ کہ زمانہ قریب میں نکل چکا ہے یا بعید میں اس سے بحث نہیں۔ لیکن قرآن کریم کے الفاظ کی صراحت بتاتی ہے کہ اس کلام کے وقت حضرت عیسیٰ علیہ السلام مہد میں نہ تھے اور بچپن کی حالت سے نکل چکے تھے۔ رہا ﴿يُكَلِّمُ النَّاسَ فِي الْمَهْدِ﴾ سو [دیکھو نمبر: 426] اور ایک یا دو دن کا بچہ تو اس وقت بھی ﴿فِي الْمَهْدِ﴾ نہیں کہلا سکتا۔ مہد کا وقت بھی کچھ بعد ہی آتا ہے۔ علاوہ ازیں اگر فی الواقع ایسا ہی ہوا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے ایک یا دو دن کی عمر میں لوگوں کو یہ بتا دیا ہو کہ میں خدا کا نبی ہوں، تو جوانی کو پہنچنے پر کون یہودی کتنا بھی سخت دل ہوتا اس کا انکار نہ کرتا۔ وہ جانتے تھے کہ مریم نے کل بچہ جنا ہے وہ جانتے تھے کہ ایک دن کا بچہ سوائے رونے کے کچھ نہیں جانتا پھر جب وہ اس قدر باتیں اس سے سن چکے ہوتے اور اس نے اپنی نبوت کی خبر پیدا ہوتے ہی دے دی ہوتی تو کس یہودی کا سر پھرا تھا کہ وہ کہتا یہ افترا ہے۔ حالانکہ ہم دیکھتے ہیں کہ جس قدر انکار حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا ہوا انبیائے بنی اسرائیل میں سے اور کسی کا انکار اس قدر نہیں ہوا۔ پس یہ تمام باتیں ایک ہی امر کو قطعی اور یقینی ٹھہراتی ہیں کہ یہ زمانہ نبوت کا کلام ہے نہ پیدائش کے فوراً بعد کا۔

1997 - **حضرت عیسیٰ پر اعتراضات اور ان کا جواب اور عیسائیوں پر اتمام حجت:** اس جواب میں جو آیت 30 تا 32 میں حضرت

عیسیٰ علیہ السلام نے دیا ہے ذیل کی باتیں کہی ہیں۔ ① میں اللہ کا بندہ ہوں۔ ② مجھے کتاب ملی ہے۔ ③ میں نبی بنایا گیا ہوں۔ ④ میں بابرکت ہوں۔ یہاں رہوں یا دوسری جگہ جاؤں۔ ⑤ مجھے جب تک زندہ ہوں نماز اور زکوٰۃ کا تاکیدی حکم ملا ہے۔ ⑥ میں اپنی ماں سے حسن سلوک کرتا ہوں، ان کی گستاخی نہیں کرتا۔ ⑦ میں جبار شقی نہیں کہ بزرگوں اور نیکوں کو برا کہوں۔

اب جیسا کہ میں نے کہا یہ زمانہ نبوت کا کلام ہے۔ اس صورت میں ہر ایک جواب اعلیٰ درجہ کی حکمت پر مبنی ہے۔ اپنی عبودیت کا اعتراف اس لیے کیا کہ لوگ آپ کی طرف خدائی کا دعویٰ منسوب کرتے تھے۔ اس کی قطعی تردید کی۔ اناجیل سے ثابت ہے کہ حضرت مسیح پر جو سب سے بڑا الزام یہودیوں نے لگایا تھا وہ یہی تھا کہ یہ خدا بنتا ہے۔ اس لیے سب سے پہلے اسی کا جواب دیا۔ جب خدا نہیں تو پھر کیا ہے۔ اسے کتاب ملی ہے۔ کتاب ملنے سے مراد توریت کا جاننا نہیں تھا۔ بلکہ بحیثیت نبی اللہ تعالیٰ کی طرف سے کتاب کا ملنا۔ اس لیے ساتھ ہی اپنے نبی ہونے کا ذکر کیا۔ گویا بتایا کہ جس طرح پہلے تم میں نبی ہوتے رہے ہیں میں بھی نبی ہوں۔ اور آیت 30 کی یہ تینوں باتیں گویا ایک خدائی کے دعوے کے اعتراض کا جواب ہیں۔ اور پھر آیت 31 میں اپنی نبوت پر دلیل دی کہ میں بابرکت ہوں۔ یعنی میرا پیغام مقبول ہے، یہاں بھی مقبول ہو رہا ہے۔ کیونکہ باوجود علماء کی مخالفت کے لوگ ان کے ساتھ ملتے بھی تھے۔ بلکہ ان کی خاطر سب کچھ چھوڑ کر ان کے ساتھ ہو گئے تھے۔ اور ﴿اَيۡنَ مَا كُنۡتُ﴾ میں پیشگوئی ہے کہ میں کسی دوسری جگہ جاؤں گا اور وہاں بھی میرا پیغام مقبول ہوگا۔ دوسری دلیل یہ ہے کہ میں نیکی پر عمل پیرا ہوں اور اسی کا حکم دیتا ہوں، اس لیے نماز، زکوٰۃ کا ذکر کیا کہ یہی دو باتیں تمام نیکیوں کا اصل الاصول ہیں۔ اور نیکی پر عامل ہونا اور اس کی تعلیم دینا یہی انبیاء کا کام ہوتا ہے۔ یہ دلیل انجیل میں بھی دی ہے کہ تم میری تعلیم کو شیطان کی طرف منسوب کرتے ہو، شیطان نیکی کی تعلیم کس طرح دے سکتا ہے؟ اس کے بعد آیت 32 میں ان اعتراضات کا جواب دیا جو سخت کلامی کے متعلق تھے۔ اول ماں کے متعلق کہ میں ہرگز ان کی گستاخی نہیں کرتا، بلکہ ان سے نیکی کرتا ہوں۔ دوسرا اوروں کے متعلق کہ میں جبار شقی نہیں کہ خواہ مخواہ دوسروں کو برا کہوں اور ان پر زیادتی کروں۔ اور عجیب بات یہ ہے کہ ان تمام باتوں میں اگر یہودیوں کے اعتراضات کا جواب ہے تو ساتھ ہی عیسائیت پر بھی اتمام حجت ہے۔

حضرت مسیح کے ماں سے نیکی کا ذکر بالخصوص کیوں کیا؟ ﴿بَرًّا بِوَالِدَتِیۡ﴾ بالخصوص قابل توجہ ہے۔ اس لیے کہ کہا جاتا ہے کہ اس سے یہ دلیل پیدا ہوتی ہے کہ آپ کا کوئی باپ نہ تھا۔ یہ دلیل صحیح نہیں۔ کیا ممکن نہیں کہ باپ مر چکا ہو؟ اور اصل بات یہ ہے کہ حضرت عیسیٰ پر اعتراض تو یہ تھا کہ یہ اپنی والدہ سے سختی کرتے ہیں اور اناجیل میں بھی لکھا ہے کہ آپ کو ''اے عورت'' کہہ کر خطاب کیا کرتے۔ اور ایک واقعہ بھی لکھا ہے کہ آپ کی والدہ نے اندر آنے کی اجازت چاہی تھی تو آپ نے اجازت نہ دی تھی۔ ''کسی نے اس کو کہا دیکھ تیری ماں اور تیرے بھائی باہر کھڑے ہیں اور تجھ سے باتیں کرنی چاہتے ہیں۔ اس نے خبر دینے والے کو جواب میں کہا کہ کون ہے میری ماں اور کون ہیں میرے بھائی؟ اور اپنے شاگردوں کی طرف ہاتھ بڑھا کہا دیکھو میری ماں اور میرے بھائی یہ ہیں کیونکہ جو کوئی میرے آسمانی باپ کی مرضی پر چلے وہی میرا بھائی اور بہن اور ماں ہے۔'' اب اس واقعہ کی اصلیت کچھ ہی ہو اور اس میں شک نہیں کہ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت مسیح کے بھائی آپ پر صرف ایمان نہ لاتے تھے بلکہ شاید مجنون بھی سمجھتے تھے۔ لیکن ماں جو ایک راستباز عورت تھی وہ ایک نبی کی منکر نہ ہو سکتی تھی۔ اور غالباً اصل واقعہ میں یا کچھ

ملاوٹ ہوگئی ہے اور یا ممکن ہے کہ ماں بھائیوں کو سفارش کے طور پر لائی ہو اس لیے اس کا نام بھی ساتھ آ گیا۔ بہر حال جن باتوں کا اس سے استدلال ہوتا ہے کہ ماں سے حضرت مسیح سختی کرتے تھے اور کہ حضرت مریم آپ پر ایمان نہ لائی تھیں ان دونوں کی تردید قرآن کریم نے کی ہے۔ سختی کا جواب تو یہ دیا کہ ﴿بَرًّا بِوَالِدَتِیۡ﴾۔ ماں سے میں نیک سلوک کرتا ہوں، ان کی گستاخی نہیں کرسکتا اور ماں کے ایمان کے متعلق دوسری جگہ فرمایا ﴿اُمُّهٗ صِدِّيۡقَةٌ﴾[المآئدۃ: 75:5] ''اور اس کی ماں صدیقہ تھی۔'' اور یہی وجہ ہے کہ ان دو باتوں کے ذکر کی ضرورت ہوئی یعنی حضرت عیسیٰ کے والدہ سے نیکی کرنے کی اور ان کی والدہ کے راستباز اور مومن عورت ہونے کی۔ یہ ہے وہ پُرحکمت طریق جس سے قرآن کریم نے حضرت مسیح اور ان کی والدہ سے ہر قسم کے الزامات کو دور کیا ہے۔

﴿اِنِّیۡ عَبۡدُ اللّٰهِ﴾ والا کلام زمانہ طفولیت کا نہیں ہوسکتا:

یوں زمانہ نبوت کا کلام قرار دے کر یہ کلام کیسا پُرحکمت ٹھہرتا ہے کہ جس کے ایک ایک لفظ میں نہ صرف تمام اعتراضات کا جو آپ پر کیے جاتے تھے اور جن کو عیسائیوں نے بھی مسیح کو خدا بنانے کے لیے قبول کرلیا ہے جواب آ گیا ہے۔ بلکہ ساتھ ہی اپنے دعویٰ کو بھی صاف کر دیا ہے۔ لیکن اگر اسے بچپن کا کلام سمجھا جائے تو اس سے کیا غرض پوری ہوتی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ حضرت مریم پر جو اعتراض تھا کہ بن باپ بچہ کیونکر ہوگیا یہ اس کا جواب ہے۔ میں کہتا ہوں اگر اس کا جواب ہوتا تو حضرت عیسیٰ کو صاف کہنا چاہئے تھا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت کاملہ سے ایسا کر دیا اور میرا اس وقت کلام کرنا اور یہ شہادت ادا کرنا اس پر کافی دلیل ہے۔ بجائے اس کے کہ وہ ذکر یہ شروع کر دیتے ہیں کہ میں خدا نہیں خدا کا بندہ ہوں، نبی ہوں، صاحب کتاب ہوں، نماز پڑھتا ہوں، زکوٰۃ دیتا ہوں، ماں سے اچھا سلوک کرتا ہوں، جبار شقی نہیں ہوں۔ تو کیا جو شخص ایسا ہو وہ بن باپ پیدا ہوا کرتا ہے۔ اس قسم کے تو بہت لوگ بنی اسرائیل میں ہو چکے تھے۔ ابھی یحییٰ کا ذکر گزر چکا ہے جو اس سے کم نہیں بڑھ کر ہی ہے۔ تو کیا وہ بن باپ پیدا ہوئے تھے۔ اس لیے ان میں یہ صفات تھیں۔ یہ سچ ہے کہ اس قدر استدلال تو ہوسکتا ہے کہ ایک ایسے راستباز انسان کی ماں زانیہ نہیں ہوسکتی، گو عیسائیوں نے تو اس کے خلاف بھی کہا ہے۔ لیکن اصل اعتراض کا جواب کچھ نہ آیا۔ اور پھر یہ ساری باتیں بے ضرورت تھیں۔ ایک بچہ کا اتنا کہہ دینا ہی کافی تھا کہ یہ بڑی راستباز ہے اور میں نبی بنوں گا۔ مگر وہ اپنے متعلق سب کچھ کہتے ہیں۔ لیکن والدہ کے متعلق ایک حرف بھی زبان پر نہیں لاتے۔ جس سے ان کے جواب کا کوئی تعلق حضرت مریم پر الزام سے سمجھا جائے۔

صلوٰۃ اور زکوٰۃ کا حکم مسیح کے آسمان پر ہونے کو غلط ٹھہراتا ہے:

علاوہ ازیں یہ بچہ کا کلام ہوکر کچھ معنی نہیں بنتے اور بالخصوص ﴿وَ اَوۡصٰنِیۡ بِالصَّلٰوةِ وَ الزَّكٰوةِ مَا دُمۡتُ حَيًّا﴾ اس ساری توجیہ کو قطعی طور پر غلط ٹھہراتا ہے۔ ﴿مَا دُمۡتُ حَيًّا﴾ اس صورت میں اس کے ساتھ مل سکتا ہے جب حکم نماز مل چکا ہو اور بچہ کو حکم نماز بے معنی ہے۔ پھر زکوٰۃ کا حکم اور بھی بے معنی ہے۔ مفسرین نے اس مشکل کو یوں دور کرنے کی کوشش کی ہے کہ صلوٰۃ سے مراد محض دعا ہے اور زکوٰۃ سے مراد تطہیر نفس ہے۔ اور اس ذریعہ سے شاید آسمان پر بٹھانے کی مشکل کو بھی حل کرنا چاہا ہے۔ مگر وہی ﴿مَا دُمۡتُ

وَ السَّلٰمُ عَلَيَّ يَوۡمَ وُلِدۡتُّ وَ يَوۡمَ اَمُوۡتُ وَ يَوۡمَ اُبۡعَثُ حَيًّا ﴿۳۳﴾

اور مجھ پر سلامتی ہے جس دن میں پیدا ہوا اور جس دن میں مروں اور جس دن میں زندہ اٹھایا جاؤں۔ (1998)

ذٰلِكَ عِيۡسَى ابۡنُ مَرۡيَمَ ۚ قَوۡلَ الۡحَقِّ الَّذِىۡ فِيۡهِ يَمۡتَرُوۡنَ ﴿۳۴﴾

یہ مریم کا بیٹا عیسیٰ ہے۔ یہ سچائی کی بات ہے جس میں وہ جھگڑتے ہیں۔

مَا كَانَ لِلّٰهِ اَنۡ يَّتَّخِذَ مِنۡ وَّلَدٍ ۙ سُبۡحٰنَهٗ ؕ اِذَا قَضٰۤى اَمۡرًا فَاِنَّمَا يَقُوۡلُ لَهٗ كُنۡ فَيَكُوۡنُ ﴿۳۵﴾

اللہ کو شایاں نہیں کہ وہ کوئی بیٹا بنائے۔ وہ پاک ہے۔ جب کسی امر کا فیصلہ کر دیتا ہے تو اسے کہتا ہے ہو جا، سو وہ ہو جاتا ہے۔ (1999)

وَ اِنَّ اللّٰهَ رَبِّىۡ وَ رَبُّكُمۡ فَاعۡبُدُوۡهُ ؕ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسۡتَقِيۡمٌ ﴿۳۶﴾

اور اللہ میرا رب اور تمہارا رب ہے سو اس کی عبادت کرو۔ یہ سیدھا رستہ ہے۔

فَاخۡتَلَفَ الۡاَحۡزَابُ مِنۡۢ بَيۡنِهِمۡ ۚ فَوَيۡلٌ لِّلَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا مِنۡ مَّشۡهَدِ يَوۡمٍ عَظِيۡمٍ ﴿۳۷﴾

پھر فرقوں نے باہم اختلاف کیا۔ سو ان پر افسوس ہے جنہوں نے کفر کیا کہ (انہیں) ایک سخت دن میں حاضر ہونا ہوگا۔ (2000)

حَيًّا﴾ کی شرط یہاں بھی کچھ نہیں بننے دیتی۔ وفات کے بعد دعا اور تزکیہ کا سلسلہ ختم نہیں ہو جاتا۔ پس یہاں وہی صلوٰۃ اور زکوٰۃ مراد ہے جو اس دنیا کی زندگی سے تعلق رکھتی ہے۔ اور یہ الفاظ نہ صرف اسی بات کو غلط ٹھہراتے ہیں کہ یہ بچپن کا کلام ہے بلکہ ساتھ ہی حضرت مسیح کے آسمان پر ہونے کو غلط ٹھہراتے ہیں۔ کیونکہ اس خاص صلوٰۃ اور زکوٰۃ کا تعلق اس زمین سے ہے۔

1998 - یہ وہی لفظ ہیں جو حضرت یحییٰ علیہ السلام کے حق میں ہیں۔ پس وہی تین زندگیاں حضرت مسیح کے لیے ہیں جو اوروں کے لیے ہیں۔ یعنی ایک ولادت سے لے کر وفات تک اس زمین میں زندگی، ایک وفات سے لے کر قیامت تک یعنی برزخ کی زندگی، ایک بعد قیامت۔ اگر آسمان پر جانا اور وہاں سے اترنا بھی کوئی حقیقت رکھتا تو اس قدر اہم واقعہ کا ذکر بھی یہاں ہونا چاہئے تھا۔

1999 - ان دو آیتوں میں کھول کو بتا دیا کہ اصل غرض اس بحث کی عیسائیت پر اتمام حجت ہے جو مسیح کو خدا بناتی ہے اور ﴿فِيۡهِ يَمۡتَرُوۡنَ﴾ میں مراد نصاریٰ کا جھگڑا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے کیونکہ آگے ﴿اَنۡ يَّتَّخِذَ مِنۡ وَّلَدٍ﴾ میں اسی کی تردید ہے۔

2000 - احزاب [دیکھو نمبر: 145] یا فرقوں سے مراد عیسائیت کے مختلف فرقے ہیں۔ (ج) ان کے باہمی اختلافات حضرت عیسیٰ علیہ السلام

اَسۡمِعۡ بِهِمۡ وَ اَبۡصِرۡ ۙ يَوۡمَ يَاۡتُوۡنَنَا لٰكِنِ الظّٰلِمُوۡنَ الۡيَوۡمَ فِىۡ ضَلٰلٍ مُّبِيۡنٍ ﴿۳۸﴾

وہ کیسے سننے والے اور کیسے دیکھنے والے ہوں گے جس دن ہمارے سامنے آئیں گے، لیکن ظالم آج کھلی گمراہی میں ہیں۔

وَ اَنۡذِرۡهُمۡ يَوۡمَ الۡحَسۡرَةِ اِذۡ قُضِىَ الۡاَمۡرُ ۘ وَ هُمۡ فِىۡ غَفۡلَةٍ وَّ هُمۡ لَا يُؤۡمِنُوۡنَ ﴿۳۹﴾ وقف لازم

اور انہیں حسرت کے دن سے ڈرا جب معاملہ کا فیصلہ کر دیا جائے گا اور وہ غفلت میں ہیں اور وہ ایمان نہیں لاتے۔ (2001)

اِنَّا نَحۡنُ نَرِثُ الۡاَرۡضَ وَ مَنۡ عَلَيۡهَا وَ اِلَيۡنَا يُرۡجَعُوۡنَ ﴿۴۰﴾ ع 2 25 5

ہم ہی زمین کے وارث ہیں اور (ان کے بھی) جو اس پر ہیں اور وہ ہماری طرف لوٹائے جائیں گے۔

وَ اذۡكُرۡ فِى الۡكِتٰبِ اِبۡرٰهِيۡمَ ؕ اِنَّهٗ كَانَ صِدِّيۡقًا نَّبِيًّا ﴿۴۱﴾

اور کتاب میں ابراہیم کا ذکر کر، وہ صدیق نبی تھا۔ (2002)

کے بارہ میں بہت ہیں اور ہر ایک عقیدہ باطلہ کا یہی حال ہوتا ہے۔ مسلمانوں کے فرقوں اور عیسائیوں کے فرقوں میں کتنا فرق ہے کہ وہ سب فرقے حتی کہ سنی اور شیعہ بھی رسول اللہ ﷺ کے متعلق کوئی اختلاف ایسا نہیں رکھتے کہ آپ کا مرتبہ کیا تھا اور ان میں اصولی اختلاف کوئی نہیں۔ مگر عیسائیوں کے تمام فرقوں میں ایک دوسرے سے اصولی اختلاف ہے اور کوئی دو فرقے اس پر اتفاق نہیں کرتے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو کیا کہیں، اور ان لچر بحثوں سے دفتروں کے دفتر سیاہ ہوئے ہیں۔ انہی سے اسکندریہ کا کتب خانہ بھرا ہوا تھا، جس کے جلانے کا غلط الزام حضرت عمر رضی اللہ عنہ پر عیسائی دیتے ہیں۔ گبن اس الزام کی تردید کر کے لکھتا ہے کہ اگر ان فضول بحثوں سے بھری ہوئی کتابوں کو واقعی عمر نے جلا کر چھ ماہ تک اسکندریہ کے حمام گرم رکھے تو اس سے بہتر مصرف ان کتابوں کا اور نہ ہو سکتا تھا۔

2001- ﴿يَوۡمَ الۡحَسۡرَةِ﴾ سے مراد قیامت ہے۔ اس لیے کہ اس دن عمل کے ہاتھ سے جاتے رہنے سے شدت غم ہوگی۔ اس آیت سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ عیسائی لمبے زمانہ تک حالتِ غفلت میں رہیں گے اور ایمان نہ لائیں گے۔ اور اس سے اگلی آیت میں بتایا کہ انہیں حکومت اور ملک ملے گا مگر آخر یہ چیزیں ہماری ہی طرف واپس آئیں گی۔

2002- اس سورت کا اصل مضمون عیسائیت پر اتمام حجت ہے اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ذکر اس لیے کیا کہ آپ تمام انبیاء کے مورث اعلیٰ ہیں، جو سلسلہ بنی اسرائیلی میں ہوئے۔ جن میں سے ایک حضرت عیسیٰ علیہ السلام بھی ہیں۔ اور بلحاظ قبولیت آپ کا مرتبہ بہت ہی

اِذۡ قَالَ لِاَبِيۡهِ يٰۤاَبَتِ لِمَ تَعۡبُدُ مَا لَا يَسۡمَعُ وَ لَا يُبۡصِرُ وَ لَا يُغۡنِىۡ عَنۡكَ شَيۡـئًا ﴿۴۲﴾

جب اس نے اپنے بزرگ سے کہا اے میرے بزرگ تو کیوں اس کی عبادت کرتا ہے جو نہ سنتا ہے اور نہ دیکھتا ہے اور نہ کچھ تیرے کام آ سکتا ہے۔

يٰۤاَبَتِ اِنِّىۡ قَدۡ جَآءَنِىۡ مِنَ الۡعِلۡمِ مَا لَمۡ يَاۡتِكَ فَاتَّبِعۡنِىۡۤ اَهۡدِكَ صِرَاطًا سَوِيًّا ﴿۴۳﴾

اے میرے بزرگ مجھے وہ علم ملا ہے جو تجھے نہیں ملا۔ سو تو میری پیروی کر، میں تجھے سیدھا رستہ دکھاؤں گا۔

يٰۤاَبَتِ لَا تَعۡبُدِ الشَّيۡطٰنَ‌ؕ اِنَّ الشَّيۡطٰنَ كَانَ لِلرَّحۡمٰنِ عَصِيًّا ﴿۴۴﴾

اے میرے بزرگ! شیطان کی عبادت نہ کر۔ کیونکہ شیطان رحمٰن کا نافرمان ہے۔ (2003)

يٰۤاَبَتِ اِنِّىۡۤ اَخَافُ اَنۡ يَّمَسَّكَ عَذَابٌ مِّنَ الرَّحۡمٰنِ فَتَكُوۡنَ لِلشَّيۡطٰنِ وَلِيًّا ﴿۴۵﴾

اے میرے بزرگ! میں ڈرتا ہوں کہ تجھے رحمٰن کی طرف سے کوئی عذاب آ پہنچے تو تُو شیطان کا دوست بن جائے۔ (2004)

بلند ہے۔ اس لیے کہ یہودی اور عیسائی اور مشرکین عرب اور مسلمان سب ان کی راستبازی کے قائل تھے۔ اور توجہ اس عظیم الشان سلسلہ نبوت کی طرف دلائی ہے جو حضرت ابراہیم علیہ السلام سے شروع ہوتا ہے اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر ختم ہوتا ہے۔

صِدِّیق کے لیے [دیکھو نمبر: 686] اور نبی کے متبع بھی مرتبہ صدیقیت کو پاتے ہیں اور وہ خود بھی صدیق ہوتا ہے۔ یعنی ایمان کے اعلیٰ سے اعلیٰ مقام پر پہنچا ہوا۔ اور صدیق کا کم سے کم مرتبہ یہ ہے کہ وہ ہمیشہ سچ بولے اور اس سے کبھی جھوٹ سرزد نہ ہو۔ اس لیے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کبھی جھوٹ نہیں بولا [لَمْ يَكْذِبْ قَطُّ] (ل) پس وہ حدیث غلط ہے جس میں تین دفعہ جھوٹ بولنا حضرت ابراہیم علیہ السلام کی طرف منسوب کیا گیا ہے۔ یوں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے متعلق جو ایک ہی بات ان کی عصمت کے خلاف بیان کی جاتی ہے اس کی تردید کر کے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی عصمت کو قائم کیا ہے۔

2003- **شیطان کو معبود بنانے سے مراد:** شیطان کو کوئی معبود نہیں کہتا۔ مگر چونکہ عبادۃ غایۃ تذلل کا نام ہے اس لیے جو لوگ شیطان کے آگے غایت درجہ کا تذلل اختیار کرتے ہوئے اس کی ہر آواز کی پیروی کرتے چلے جاتے ہیں وہ گویا اسی کی عبادت کرتے ہیں۔ بعض نے شیطان کی عبادت سے مراد بتوں کی عبادت لی ہے۔ اس لیے کہ شیطان ہی اس کی تحریک کرتا ہے۔ (ر) ابراہیم علیہ السلام کے اس اَبّ کے متعلق [دیکھو نمبر: 967]۔

2004- **شیطان کا ولی بننے سے مراد:** رحمٰن کی طرف عذاب کی نسبت اس لیے کی کہ اس کا رحم اتنا بڑا ہے کہ بلا بدل بھی رحم کرتا ہے۔

قَالَ اَرَاغِبٌ اَنۡتَ عَنۡ اٰلِهَتِىۡ يٰۤاِبۡرٰهِيۡمُ‌ ۚ لَئِنۡ لَّمۡ تَنۡتَهِ لَاَرۡجُمَنَّكَ وَاهۡجُرۡنِىۡ مَلِيًّا ﴿۴۶﴾

اس نے کہا اے ابراہیم کیا تو میرے معبودوں سے منہ موڑتا ہے۔ اگر تو باز نہ آئے میں تجھے سنگسار کروں گا اور تو ایک مدت مجھ سے الگ ہو جا۔ (2005)

قَالَ سَلٰمٌ عَلَيۡكَ‌ ۚ سَاَسۡتَغۡفِرُ لَكَ رَبِّىۡ‌ ؕ اِنَّهٗ كَانَ بِىۡ حَفِيًّا ﴿۴۷﴾

کہا تجھ پر سلامتی ہو۔ میں اپنے رب سے تیرے لیے استغفار کروں گا۔ وہ مجھ پر بہت مہربان ہے۔ (2006)

وَاَعۡتَزِلُكُمۡ وَمَا تَدۡعُوۡنَ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ وَاَدۡعُوۡا رَبِّىۡ‌ ۖ عَسٰٓى اَلَّاۤ اَكُوۡنَ بِدُعَآءِ رَبِّىۡ شَقِيًّا ﴿۴۸﴾

اور میں تم سے اور ان سے جنہیں تم اللہ کے سوا پکارتے ہو الگ ہوتا ہوں اور میں اپنے رب سے دعا کروں گا۔ امید ہے میں اپنے رب سے دعا کر کے محروم نہیں رہوں گا۔

فَلَمَّا اعۡتَزَلَهُمۡ وَمَا يَعۡبُدُوۡنَ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ‌ۙ وَهَبۡنَا لَهٗۤ اِسۡحٰقَ وَيَعۡقُوۡبَ‌ ؕ

سو جب ان سے الگ ہو گیا اور ان سے جن کی وہ اللہ کے سوائے عبادت کرتے تھے ہم نے اسے اسحاق اور یعقوب دیئے

پس اس کا عذاب سوائے اس کے نہیں آتا کہ انسان حد سے نکل جائے یا شاید اس لیے کہ ایک رنگ میں بت پرست رحمانیت کا منکر ہے اور اس عذاب کا نتیجہ یہ بتایا کہ تو شیطان کا ولی بن جائے یعنی دوسروں کے بہکانے میں شیطان کا مددگار ہو جائے۔ پس اس عذاب سے مراد اللہ تعالیٰ کی ناراضگی ہے، گو اس میں کوئی ظاہری دکھ نہ ہو۔ یعنی خود شیطان کا اتباع کرتے کرتے تو اللہ سے اس قدر دور جا پڑے تو پھر خود دوسروں کو غلط راہ پر ڈالنے لگے۔ اسی دوری کو یہاں عذاب کہا ہے اور اللہ تعالیٰ سے بُعد اور دوری سب سے بڑا عذاب ہے۔

2005- رَجۡمٌ کے معنی برا کہنا، دھتکارنا بھی آتے ہیں۔ [دیکھو نمبر: 410] یہاں یہی معنی مروی ہیں۔ (ج) مَلِیّ کے لیے [دیکھو نمبر: 573]۔

2006- ﴿حَفِیّ﴾ حَفِیَ۔ اِحۡفَاءٌ کے لیے [دیکھو نمبر: 1186] اور حفارقت قدم اور پیر کے ننگا ہونے کو کہتے ہیں اور [حَفَی بِالرَّجُلَ] کے معنی ہیں اس کے اکرام میں غایت درجہ کو پہنچا۔ اس لیے حَفِیّ وہ مہربانی کرنے والا ہے جو اکرام میں غایت درجہ کو پہنچے۔ (ل) اور کسی چیز کا علم رکھنے والے کو بھی کہتے ہیں۔ (غ)

یہاں بدی کے مقابل نیکی کا طریق سکھایا ہے۔ وہ برا کہتا ہے حضرت ابراہیم علیہ السلام سلام علیک فرماتے ہیں اور استغفار کرنے کا وعدہ کرتے ہیں۔ دشمن سے یہ پیار کا عملی ثبوت ہے۔ عیسائیوں کو فخر کہ یہ تعلیم حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے دی بے جا ہے۔ ہر نبی کی یہی تعلیم

وَ كُلًّا جَعَلۡنَا نَبِيًّا ﴿۴۹﴾

اور ہر ایک کو ہم نے نبی بنایا۔ (2007)

وَ وَهَبۡنَا لَهُمۡ مِّنۡ رَّحۡمَتِنَا وَ جَعَلۡنَا لَهُمۡ لِسَانَ صِدۡقٍ عَلِيًّا ﴿۵۰﴾ ع

اور ہم نے انہیں اپنی رحمت سے حصہ دیا اور ہم نے ان کے لیے سچا ذکر بلند کیا۔ (2008)

وَ اذۡكُرۡ فِى الۡكِتٰبِ مُوۡسٰۤى ۫ اِنَّهٗ كَانَ مُخۡلَصًا وَّ كَانَ رَسُوۡلًا نَّبِيًّا ﴿۵۱﴾

اور کتاب میں موسیٰ کا ذکر کر۔ وہ ہر کھوٹ سے پاک تھا اور رسول نبی تھا۔ (2009)

تھی اور یہی بتانا مقصود ہے۔ استغفار ابراہیم علیہ السلام کے لیے [دیکھو نمبر: 1355]۔

2007- یہاں اسحاق اور یعقوب علیہما السلام دینے کا ذکر ہے۔ اشارہ یہ ہے کہ جب اس نے اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے اپنے بزرگ اور اپنی قوم سے علیحدگی اختیار کی تو ہم نے اسے ایک ایسی نسل دی جس میں ایک مدت تک سلسلہ نبوت چلا۔ اسی لیے اسحاق علیہ السلام کے ساتھ اس کے بیٹے یعقوب علیہ السلام کا بھی ذکر کیا۔ یہاں حضرت اسماعیل علیہ السلام کا ذکر اسی لیے نہیں کیا اور اس لیے بھی کہ اسماعیل کا ذکر آگے علیحدہ آتا ہے۔ کیونکہ اس سے ایک علیحدہ نسل چلی جس میں ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پیدا ہوئے۔

2008- ﴿لِسَانَ﴾۔ زبان یعنی عضو کو بھی کہتے ہیں اور اس کی قوت کو بھی۔ (غ) اور لسان صدق کے لیے [دیکھو نمبر: 1371]۔ اور ﴿وَ احۡلُلۡ عُقۡدَةً مِّنۡ لِّسَانِىۡ﴾ [طٰہٰ: 27:20] ''اور میری زبان کی گرہ کھول دے۔'' میں مراد قوتِ لسان ہی ہے نہ خود لسان۔ اس لیے کہ عقدہ قوتِ لسان یعنی نطق میں تھا نہ زبان میں۔ (غ)

2009- ﴿مُخۡلَص﴾ [اَخلَصَه اَمحَضَه] (ل) یعنی اُخلِصَ کے معنی ہیں ایک چیز کو ہر قسم کی آمیزش سے پاک کیا یا رکھا۔ اس لیے مُخۡلَص وہ ہے جسے اللہ تعالیٰ نے ہر قسم کی میل یا کھوٹ سے پاک رکھا ہو اور مُخۡلِص وہ ہے جو اللہ تعالیٰ کی توحید کو ہر آمیزش سے پاک رکھے اسی لیے ﴿قُلۡ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ﴾ [اخلاص: 1:112] ''کہہ، اللہ (تعالیٰ) ایک ہے۔'' کا نام سورۃ الاخلاص ہے کیونکہ اس میں توحید کو ہر آمیزش سے پاک کیا گیا ہے۔ (ل)

چونکہ سورت کا اصل مضمون عیسائیت پر اتمام حجت ہے اس لیے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بعد سلسلہ اسرائیلی کے اس عظیم الشان نبی کا ذکر کیا جو اس سلسلہ کا بانی ہے اور باقی تمام انبیاء کے ذکر کو چھوڑ دیا۔ لیکن ہارون کا ذکر ساتھ کر دیا۔ اسی بات کی طرف اشارہ کرنے کو جو [نمبر: 1983] میں بیان ہوئی۔ اور چونکہ عیسائی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بے گناہ ہونے پر بڑا زور دیتے ہیں اس لیے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو مُخۡلَص فرمایا یعنی جو ہر قسم کی میل اور کھوٹ سے پاک تھا۔ اس سے بڑھ کر بے گناہی متصور نہیں ہو سکتی۔ اور یہاں حضرت موسیٰ علیہ السلام کو رسول نبی کہا ہے۔ اصطلاح شرعی میں ہر ایک رسول نبی ہے اور ہر نبی رسول ہے۔ اس لیے جس کو ایک جگہ نبی کہا ہے اسے دوسری جگہ رسول کہا ہے۔ مثلاً حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق اوپر فرمایا ﴿وَ جَعَلَنِىۡ نَبِيًّا﴾ اور

وَ نَادَيْنٰهُ مِنْ جَانِبِ الطُّوْرِ الْاَيْمَنِ وَ قَرَّبْنٰهُ نَجِيًّا ۝۵۲

اور ہم نے اسے پہاڑ کی بابرکت طرف سے پکارا اور اپنے راز بتانے کو اسے مقرب بنایا۔ (2010)

وَ وَهَبْنَا لَهٗ مِنْ رَّحْمَتِنَاۤ اَخَاهُ هٰرُوْنَ نَبِيًّا ۝۵۳

اور ہم نے اسے اپنی رحمت سے اس کا بھائی ہارون نبی عطا فرمایا۔

وَ اذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ اِسْمٰعِيْلَ ز اِنَّهٗ كَانَ صَادِقَ الْوَعْدِ وَ كَانَ رَسُوْلًا نَّبِيًّا ۝۵۴

اور کتاب میں اسماعیل کا ذکر کر وہ وعدے کا سچا تھا اور رسول نبی تھا۔ (2011)

آل عمران میں فرمایا تھا﴿وَ رَسُوْلًا اِلٰى بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ﴾ ''اور وہ بنی اسرائیل کی طرف رسول ہوگا۔'' اور دونوں ناموں کو اکٹھا کرنے میں دونوں کے لغوی معنوں کی طرف اشارہ ہے۔ رسول کے لیے [دیکھو نمبر: 110] وہ ہے جسے پیغام دے کر بھیجا جاتا ہے اور نبی وہ ہے [دیکھو نمبر: 91] جسے اللہ تعالیٰ اپنی توحید کی خبر دیتا ہے اور اسے غیب کی باتیں بتاتا ہے۔ اور چونکہ رسول سوائے پیغام الٰہی کے کسی اور چیز کی وجہ سے بھی ہوسکتا ہے اس لیے بعد میں لفظ نبی لایا گیا۔

2010- ﴿اَيْمَنِ﴾۔ یُمْن کے معنی برکت ہیں اور اَیمَن برکت والا۔ (ل) اور اس کے معنی دایاں بھی ہیں۔ مگر پہاڑ کا دایاں یا بایاں موزوں معنی نہیں۔ اور بابرکت پہاڑ کو ان برکات کی وجہ سے کہا جو وہاں حضرت موسیٰ علیہ السلام پر نازل ہوئیں۔ اور یہاں ایمن جانب کی صفت بھی ہوسکتی ہے اور طور کی بھی۔

نَجِيًّا۔ نجاۃ کے لیے [دیکھو نمبر: 72] اور ناجَیتُہ کے معنی ہیں سارَرتُہ یعنی اسے اپنا رازدار بنایا اور اس کا اصل نجاۃ سے ہے یعنی تم اس کی ایسی بات میں مدد کرو جس میں اس کی نجات ہے۔ (غ) اور نجیّ مُنَاجی ہے۔ (غ) یعنی جسے اپنے راز پر اطلاع دی جائے۔

2011- **حضرت اسماعیلؑ کی رسالت:** حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد حضرت اسماعیل علیہ السلام کا ذکر کیا ہے۔ اس لیے کہ سلسلہ موسوی کے ختم ہونے کے بعد حضرت اسماعیل علیہ السلام کا سلسلہ شروع ہوتا ہے اور نبوت سلسلہ موسوی سے سلسلہ محمدی میں منتقل ہوتی ہے۔ اور حضرت اسماعیل علیہ السلام کے ﴿صَادِقَ الْوَعْدِ﴾ ہونے کے ذکر میں بائبل کے اس بیان کی تردید ہے کہ اسماعیل ایک وحشی آدمی تھا [پیدائش: 12:16]۔ اور ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم میں بھی یہ وصف کمال کو پہنچا ہوا تھا۔ اور امت محمدیہ میں بھی وعدہ کی سچائی کی صفت خاص طور پر نمایاں نظر آتی ہے بمقابلہ دوسری اقوام کے، جن میں وعدہ توڑنا ایک معمولی بات ہے۔ حضرت اسماعیل علیہ السلام قبیلہ جرہم کی طرف مبعوث ہوئے تھے۔ (ر) کیونکہ اس وقت مکہ میں کوئی آبادی نہ تھی۔ بائبل میں ان کی رسالت کا

وَ كَانَ يَاۡمُرُ اَهۡلَهٗ بِالصَّلٰوةِ وَ الزَّكٰوةِ ۪ وَ كَانَ عِنۡدَ رَبِّهٖ مَرۡضِيًّا ﴿۵۵﴾

اور اپنے ساتھیوں کو نماز اور زکوٰۃ کا حکم دیتا تھا اور اپنے رب کے نزدیک پسندیدہ تھا۔ (2012)

وَ اذۡكُرۡ فِى الۡكِتٰبِ اِدۡرِيۡسَ ۫ اِنَّهٗ كَانَ صِدِّيۡقًا نَّبِيًّا ﴿۵۶﴾ۙ

اور کتاب میں ادریس کا ذکر کر، وہ صدیق نبی تھا۔

وَّ رَفَعۡنٰهُ مَكَانًا عَلِيًّا ﴿۵۷﴾

اور ہم نے اسے بلند مقام پر اٹھالیا۔ (2013)

ذکر نہیں۔

2012- **حضرت اسماعیلؑ کی عصمت:** صلوٰۃ اور زکوٰۃ کی تعلیم سب انبیاء میں مشترک تھی۔ یہ دو اصل دین کے ہمیشہ سے چلے آئے ہیں۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو بھی یہی حکم دیا تھا۔ حضرت اسماعیل علیہ السلام بھی اپنے پیروؤں کو اسی راہ پر چلاتے تھے اور آپ کے مَرۡضِیًّا یا رضائے الٰہی کا محل ہونے میں یہ بتایا کہ ان سے کوئی فعل اللہ کی رضا کے خلاف سرزد نہیں ہوا اور یہی مقام عصمت ہے۔

2013- **حضرت ادریسؑ کا رفع:** حضرت ادریس علیہ السلام وہی ہیں جن کا ذکر بائبل میں حنوک کے نام سے ہے۔ اور یہ حضرت نوح علیہ السلام سے پہلے کے ہیں۔ بعض کے نزدیک ان میں اور نوح علیہ السلام میں ایک ہزار سال کا فرق ہے، جس طرح نوح علیہ السلام اور ابراہیم علیہ السلام میں ایک ہزار سال کا فرق ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ وہ حضرت آدم علیہ السلام کے بعد پہلے رسول ہیں۔ اور بائبل میں ہے کہ ''حنوک خدا کے ساتھ ساتھ چلتا تھا اور غائب ہو گیا اس لیے کہ خدا نے اسے لے لیا۔'' [پیدائش: 24:5] اور پولوس کہتا ہے ''ایمان ہی سے حنوک اٹھالیا گیا تا کہ موت کو نہ دیکھے۔'' [عبرانیوں: 5:11] اسی وجہ سے ہمارے بعض مفسرین نے بھی لکھ دیا ہے کہ حضرت ادریس علیہ السلام زندہ آسمان پر اٹھائے گئے اور وہ چوتھے یا چھٹے آسمان پر ہیں۔ اور بعض نے کہا کہ چوتھے آسمان پر ان کی روح قبض کر لی گئی۔ ان باتوں کی کوئی اصلیت نہ قرآن شریف میں ہے نہ حدیث صحیح میں۔ اور کعب احبار سے جو روایت ہے کہ ایک فرشتہ حضرت ادریس علیہ السلام کا دوست انہیں چوتھے آسمان پر لے گیا تھا اور وہاں ملک الموت نے اس کی روح قبض کر لی تو اس کو نقل کر کے ابن کثیر نے لکھا ہے کہ یہ کعب کی اسرائیلیات ہیں اور ان میں بعض باتیں نا قابل قبول ہیں۔ اور ﴿وَّ رَفَعۡنٰهُ مَكَانًا عَلِيًّا﴾ کی تفسیر حسن سے مروی ہے [هُوَ شَرَفُ النُّبُوَّةَ وَالزُّلْفٰى عِنْدَ اللّٰهِ تَعَالٰى] (روح المعانی، جلد16، صفحہ 105) (ر) یعنی اس سے مراد شرف نبوۃ اور قرب الٰہی ہے اور پھر روایات کو نقل کر کے بتایا ہے کہ بلند مکان سے مراد علوشان اور بلند مرتبہ ہو تو یہ تعریف کی بات ہے ورنہ صرف اونچے مکان پر لے جانا کوئی حقیقت نہیں رکھتا۔ (ر) اور حضرت ادریس علیہ السلام کے رفع کا ذکر کر کے یہ بھی بتا دیا

اُولٰٓئِكَ الَّذِيۡنَ اَنۡعَمَ اللّٰهُ عَلَيۡهِمۡ مِّنَ النَّبِيّٖنَ مِنۡ ذُرِّيَّةِ اٰدَمَ ۫ وَمِمَّنۡ حَمَلۡنَا مَعَ نُوۡحٍ ۖ وَّمِنۡ ذُرِّيَّةِ اِبۡرٰهِيۡمَ وَ اِسۡرَآءِيۡلَ ۖ وَمِمَّنۡ هَدَيۡنَا وَ اجۡتَبَيۡنَا ؕ اِذَا تُتۡلٰى عَلَيۡهِمۡ اٰيٰتُ الرَّحۡمٰنِ خَرُّوۡا سُجَّدًا وَّبُكِيًّا ۩ ﴿۵۸﴾

یہ نبیوں میں سے وہ ہیں جن پر اللہ نے انعام کیا آدم کی نسل سے اور ان سے جنہیں ہم نے نوح کے ساتھ سوار کیا اور ابراہیم اور اسرائیل کی نسل سے اور ان میں سے جنہیں ہم نے ہدایت دی اور چن لیا۔ جب ان پر رحمٰن کی آیتیں پڑھی جاتیں وہ سجدہ کرتے ہوئے اور روتے ہوئے گر پڑتے۔ (2014)

اَلسَّجۡدَة 4

فَخَلَفَ مِنۡۢ بَعۡدِهِمۡ خَلۡفٌ اَضَاعُوا الصَّلٰوةَ وَ اتَّبَعُوا الشَّهَوٰتِ فَسَوۡفَ يَلۡقَوۡنَ غَيًّا ۙ﴿۵۹﴾

پھر ان کے بعد ناخلف جانشین ہوئے جنہوں نے نماز کو ضائع کیا اور نفسانی خواہشوں کی پیروی کی سو وہ ہلاکت کو پالیں گے۔ (2015)

کہ رفع بھی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی خصوصیت نہیں بلکہ سب انبیاء کا ہوا۔

انبیاء کی غیر تاریخی ترتیب میں حکمت:

اس سورت میں جو ترتیب انبیاء ہے وہ تاریخی نہیں۔ مگر اس کی وجوہات خاص ہیں۔ پہلے یحییٰ علیہ السلام کا ذکر کیا جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ذکر کے لیے بطور تمہید تھا۔ پھر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا جو اصل مقصود ہے۔ پھر حضرت ابراہیم علیہ السلام جہاں سے ایک عظیم الشان سلسلہ نبوت چلتا ہے۔ اس میں اول ایک شاخ کے ذکر کو اسحاق و یعقوب سے شروع کر کے جو ابتدا میں ہیں موسیٰ اور ہارون پر جو سلسلہ موسوی کی بنیاد رکھنے والے ہیں ختم کر دیا اور دوسری شاخ میں صرف حضرت اسماعیل علیہ السلام کا ذکر کیا۔ کیونکہ اس کے اول اسماعیل علیہ السلام اور آخر حضرت محمد مصطفیٰ احمد مجتبیٰ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ پھر ادریس علیہ السلام کا ذکر کر کے یہ بتایا کہ سلسلہ نبوت کی بنیاد ابراہیم علیہ السلام سے نہیں رکھی گئی بلکہ جب سے انسان ہوا اسی وقت سے انبیاء بھی ہوتے چلے آئے ہیں۔ اور یہ ترتیب اسی سورت سے خاص ہے۔ کیونکہ اس میں عیسائی مذہب پر اتمام حجت ہے۔

2014- آدم کی ذریت سے تو سب ہیں مگر یہاں قریب ترین جد کا ذکر کیا ہے۔ یعنی ادریس آدم کی ذریت سے۔ ابراہیم نوح کی ذریت سے، اسحاق اور اسماعیل ابراہیم کی ذریت سے۔ موسیٰ، ہارون، عیسیٰ، یحییٰ اسرائیل کی ذریت سے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے یوں ذریت میں شامل ہونے پر مفسرین کو یہ کہنا پڑا ہے کہ نسب لڑکی کی طرف سے بھی ہوتی ہے۔ اور ان تمام انبیاء کے ایک جا ہدایت اور اجتبا کا ذکر کر کے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی فرضی خصوصیت کو توڑا ہے۔

اِلَّا مَنۡ تَابَ وَ اٰمَنَ وَ عَمِلَ صَالِحًا فَاُولٰٓئِكَ يَدۡخُلُوۡنَ الۡجَنَّةَ وَ لَا يُظۡلَمُوۡنَ شَيۡـًٔا ﴿۶۰﴾

مگر جنہوں نے توبہ کی اور ایمان لائے اور اچھے عمل کیے تو یہ جنت میں داخل ہوں گے اور ان پر کچھ ظلم نہ کیا جائے گا۔

جَنّٰتِ عَدۡنِ ۨ الَّتِىۡ وَعَدَ الرَّحۡمٰنُ عِبَادَهٗ بِالۡغَيۡبِ ؕ اِنَّهٗ كَانَ وَعۡدُهٗ مَاۡتِيًّا ﴿۶۱﴾

ہمیشگی کے باغوں میں جن کا رحمٰن نے اپنے بندوں سے بن دیکھے وعدہ کیا ہے اس کا وعدہ آ کر رہے گا۔ (2016)

لَا يَسۡمَعُوۡنَ فِيۡهَا لَغۡوًا اِلَّا سَلٰمًا ؕ وَ لَهُمۡ رِزۡقُهُمۡ فِيۡهَا بُكۡرَةً وَّ عَشِيًّا ﴿۶۲﴾

اس میں کوئی بیہودہ بات نہیں سنیں گے۔ ہاں سلام (سنیں گے) اور ان کا رزق اس میں صبح اور شام انہیں ملے گا۔ (2017)

تِلۡكَ الۡجَنَّةُ الَّتِىۡ نُوۡرِثُ مِنۡ عِبَادِنَا مَنۡ كَانَ تَقِيًّا ﴿۶۳﴾

یہ وہ جنت ہے جس کا وارث ہم اپنے بندوں میں سے اسے بناتے ہیں جو متقی ہوں۔

2015- غَیّ کے معنی یہاں راغب نے عذاب لیے ہیں مگر [دیکھو نمبر: 1058] [اَغْوَيْتَنِي اَهْلَكْتَنِي] (ج) شاہد ہے کہ غیّ کے معنی ہلاکت بھی ہیں، اضاعت الصلوٰۃ یا نماز کا ضائع کرنا اس کا ترک کر دینا بھی ہے یا ظاہر صورت کو قائم رکھ کر حقیقت سے بے خبر ہونا یا اس کے اوقات کو ترک کر دینا۔ اور گو لفظ عام ہیں مگر بالخصوص عیسائیوں نے عبادات کو کفارہ کے خلاف سمجھ کر بالکل ترک کر دیا ہے اور شہوات کے پیچھے بھی جس قدر یہ قوم لگی ہے دوسری کوئی نہیں لگی۔ آج مسلمان بھی نماز کو ضائع کر رہے ہیں۔

2016- ﴿بِالۡغَيۡبِ﴾ میں با ملابست کے لیے ہے یعنی اس نے جنت کا وعدہ کیا ہے اور وہ ان سے غیب کا حکم رکھتی ہے۔ (ر) کیونکہ وہ ان آنکھوں سے نہیں دیکھی جاتی بلکہ اس کا علم دوسرے حواس سے ہوتا ہے۔

﴿مَاۡتِيًّا﴾- اتیان (اَتٰی) سہولت سے آنے پر بولا جاتا ہے اور یہاں ماتی بمعنی اٰتی ہے یعنی مفعول بمعنی فاعل اور مراد ہے کہ ضرور آ کر رہے گا۔

2017- بہشت میں رات نہیں کہ وہاں صبح اور شام ہوں۔ آنحضرت ﷺ سے دریافت کیا گیا تو آپ نے فرمایا کہ وہ اوقات مراد ہیں جن میں یہاں نماز پڑھتے تھے۔ (ر) گویا ان کا رزق وہی نماز کا پھل ہے اور صبح و شام سے دوام بھی مراد ہوتا ہے۔ یعنی ہر حالت میں اور تمام اوقات میں اور سلام وہاں ہونے سے مراد تمام آفات سے سلامتی کا ہونا ہے اور سلام سننے سے مراد ایک تو

وَ مَا نَتَنَزَّلُ اِلَّا بِاَمْرِ رَبِّكَ ۚ لَهٗ مَا بَيْنَ اَيْدِيْنَا وَ مَا خَلْفَنَا وَ مَا بَيْنَ ذٰلِكَ ۚ وَ مَا كَانَ رَبُّكَ نَسِيًّا ﴿۶۴﴾

اور ہم تیرے رب کے حکم کے سوائے نازل نہیں ہوتے۔ اسی کا ہے جو کچھ ہمارے سامنے ہے اور جو کچھ ہمارے پیچھے ہے اور جو اس کے درمیان ہے اور تیرا رب بھولنے والا نہیں۔ (2018)

رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ مَا بَيْنَهُمَا فَاعْبُدْهُ وَ اصْطَبِرْ لِعِبَادَتِهٖ ؕ هَلْ تَعْلَمُ لَهٗ سَمِيًّا ﴿۶۵﴾ ع 4/15/7

آسمانوں اور زمین کا رب اور جو کچھ ان دونوں کے درمیان ہے سو اس کی عبادت کر اور اسی کی عبادت پر مضبوط رہ۔ کیا تو اس جیسا کوئی اور جانتا ہے۔ (2019)

وَ يَقُوْلُ الْاِنْسَانُ ءَاِذَا مَا مِتُّ لَسَوْفَ اُخْرَجُ حَيًّا ﴿۶۶﴾

اور انسان کہتا ہے کیا جب میں مر جاؤں گا تو (پھر) زندہ کر کے نکالا جاؤں گا۔ (2020)

ان کا باہمی سلام ہے ﴿تَحِيَّتُهُمْ فِيْهَا سَلٰمٌ﴾ [إبراهيم: 23:14] ''ان میں ان کی دعائے ملاقات سلام ہوگی۔'' اور دوسرا ملائکہ کا ان پر سلام کہنا۔ ﴿سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ طِبْتُمْ﴾ [الزمر: 73:39] ''تم پر سلام ہو تم پاک ہو۔''

2018- اسی ایک روایت کی بنا پر جو اصحاب کہف کے سوال کے متعلق ہے یہاں یہ سمجھا گیا ہے کہ حضرت جبریل کا قول ہے جس میں گویا یہ بتایا ہے کہ وحی کیوں رک گئی تھی اور بخاری میں ابن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت صرف اس قدر ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جبریل کو کہا تھا کہ آپ اس سے زیادہ نزول کیوں نہیں کرتے۔ تو انہوں نے یہ جواب دیا۔ لیکن آیت کے الفاظ سے جو مفہوم اقرب الی الذہن معلوم ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ یہاں خود انبیاء علیہم السلام کے نزول کا ذکر ہے۔ اور اگر فرشتوں کا آنا بھی مراد ہو تو پھر بھی مراد نزول قرآن ہی ہوگی۔ کیونکہ لیلۃ القدر جس میں قرآن نازل ہوا اس میں ملائکہ بھی نازل ہوتے ہیں۔ تو پس یا تو عام طور پر انبیاء کا آنا مراد ہے کہ نبی تبھی آتا ہے جب امر رب ہو اور یا بالخصوص نزول قرآن کریم کا ہی ذکر ہے کہ اب جو یہ وحی نازل ہوئی ہے تو یہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے ہی ہے۔ ﴿مَا بَيْنَ اَيْدِيْنَا﴾ سے مراد مستقبل اور ﴿مَا خَلْفَنَا﴾ سے مراد ماضی اور ﴿مَا بَيْنَ ذٰلِكَ﴾ حال ہے اور ﴿مَا كَانَ رَبُّكَ نَسِيًّا﴾ میں یا تو یہ مراد ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے عدوں کو بھول نہیں سکتا جو اس نے ایک آخری رسول بھیجنے کے متعلق سب انبیاء سے کیے تھے اور یا یہ کہ وہ لوگوں کو اس طرح ضلالت کی حالت میں چھوڑ نہیں سکتا۔ اور بعض نے مراد یہ لی ہے کہ اپنے نبیوں کو نہیں چھوڑ سکتا۔ یعنی ان کی نصرت کرے گا۔

2019- اصْطَبِرْ - اِصْطَبَارٌ۔ صبر سے باب افتعال ہے اور اصْطَبِرْ کے معنی ہیں [تَحَمَّلِ الصَّبْرَ بِجَهْدِكَ] (غ) اپنی کوشش سے صبر کو قائم رکھ۔ سَمِيّ کے لیے [دیکھو نمبر: 1627] اس جیسا کوئی نہیں، اس میں ابنیت کی بھی تردید ہے۔

اَوَ لَا يَذۡكُرُ الۡاِنۡسَانُ اَنَّا خَلَقۡنٰهُ مِنۡ قَبۡلُ وَ لَمۡ يَكُ شَيۡـًٔا ﴿۶۷﴾

کیا انسان یاد نہیں کرتا کہ ہم نے اسے پہلے پیدا کیا اور وہ کچھ بھی نہ تھا۔

فَوَ رَبِّكَ لَنَحۡشُرَنَّهُمۡ وَ الشَّيٰطِيۡنَ ثُمَّ لَنُحۡضِرَنَّهُمۡ حَوۡلَ جَهَنَّمَ جِثِيًّا ﴿۶۸﴾

سو تیرے رب کی قسم ہم ضرور انہیں اور (ان کے) شیطانوں کو اکٹھا کریں گے پھر ہم ضرور انہیں دوزانو بیٹھے ہوئے دوزخ کے گرد لا حاضر کریں گے۔ (2021)

ثُمَّ لَنَنۡزِعَنَّ مِنۡ كُلِّ شِيۡعَةٍ اَيُّهُمۡ اَشَدُّ عَلَى الرَّحۡمٰنِ عِتِيًّا ﴿۶۹﴾

پھر ہر گروہ میں سے ہم ضرور انہیں الگ نکال لیں گے جو رحمٰن کے خلاف سرکشی میں سخت تر تھے۔

ثُمَّ لَنَحۡنُ اَعۡلَمُ بِالَّذِيۡنَ هُمۡ اَوۡلٰى بِهَا صِلِيًّا ﴿۷۰﴾

پھر یقیناً ہم انہیں خوب جانتے ہیں جو اس میں داخل ہونے کے زیادہ اہل ہیں۔ (2022)

2020- یہاں کسی خاص انسان کا ذکر نہیں بلکہ ہر اس انسان کا ہے جو منکر بعث ہے۔

2021- جِثِیّ۔ جَثِیَ کے معنی گھٹنوں پر بیٹھ گیا اور اور جَاثَ گھٹنوں پر بیٹھنے والا ﴿وَ تَرٰى كُلَّ اُمَّةٍ جَاثِيَةً﴾ [الجاثية: 28:45] ''اور تو ہر امت کو گھٹنوں کے بل دیکھے گا'' اور اس کی جمع جُثّی ہے اور جِثّی بھی ہے۔ (ل)

شیاطین سے مراد یہاں وہ شیطان بھی ہو سکتے ہیں جو ہر انسان کے قرین ہیں مگر شیاطین الانس زیادہ قرین قیاس ہے۔

2022- صِلِیّ صالٍ کی جمع ہے جس کے معنی آگ میں داخل ہونے والا۔ (غ) [دیکھو نمبر: 12] ﴿اِلَّا مَنۡ هُوَ صَالِ الۡجَحِيۡمِ﴾ [الصافات: 163:37] ''سوائے اس کے جو (خود) دوزخ میں جانے والا ہے۔''

بدکاروں کے لیے جہنم ضروری ہے:

اَوْلٰی لانے سے یہ مطلب نہیں کہ بعض زیادہ اہل ہیں بعض کم۔ گو یہ بھی معنی کیے گئے ہیں اور ہو سکتے ہیں کہ جو لوگ کفر میں زیادہ سخت تھے جیسا اوپر کی آیت میں ہے وہی آگ میں بھی پہلے داخل ہوں گے۔ اور ان کا عذاب بھی سخت تر ہوگا۔ مگر یہاں مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو خوب جانتا ہے جن کا آگ میں داخل ہونا بہ نسبت ان کے باہر رہنے کے زیادہ مفید ہے۔ اس لیے وہ آگ میں داخل ہونے کی بہ نسبت نہ داخل ہونے والوں کے زیادہ اہل ہیں۔ اس میں یہ بتایا ہے کہ ان کا آگ میں

وَ اِنۡ مِّنۡكُمۡ اِلَّا وَارِدُهَا ۚ كَانَ عَلٰى رَبِّكَ حَتۡمًا مَّقۡضِيًّا ۚ﴿۷۱﴾

اور تم میں سے کوئی نہیں مگر اس پر سے گزرے گا یہ تیرے رب پر لازم ہے (جس کا) فیصلہ ہو چکا (ہے)۔ (2023)

داخل ہونا ہی ان کا علاج ہے۔

2023- وَارِدُ۔وَرُوْدٌ کے لیے [دیکھو نمبر: 1500] اس کے اصل معنی ہیں پانی یا آگ پر پہنچنا بغیر اس میں داخل ہونے کے۔ گو بعض نے توسیع کر کے داخل ہونا بھی اس میں شامل کر لیا ہے۔

حَتْمَ۔ حَتْمَ ایک امر کا احکام یعنی مضبوط کرنا ہے یا ایک بات کا واجب کرنا یا قضاء۔ (ل)

مومن دوزخ میں شامل نہ ہوں گے:

ورود معنی کو مدنظر رکھتے ہوئے اس آیت کے معنی میں قطعاً کوئی دقت نہیں رہتی۔ گو ﴿اِنۡ مِّنۡكُمۡ﴾ میں تمام انسان یعنی مومن و کافر شامل ہوں۔ کیونکہ یہ دوزخ کے اوپر پہنچنا ہے نہ دوزخ میں داخل ہونا۔ اور ایک حدیث میں ہے کہ جسے غریب کہا گیا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ نیک اور بد دونوں اس میں داخل ہوں گے۔ مگر نیکوں پر وہ آگ ٹھنڈک اور سلامتی ہوگی۔ اور ایک اثر میں ہے کہ جب اہل جنت جنت میں داخل ہوں گے تو وہ دریافت کریں گے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا تھا ﴿اِنۡ مِّنۡكُمۡ اِلَّا وَارِدُهَا﴾ تو کہا جائے گا تم اس کے اوپر سے گزر آئے ہو اور اس کی آگ بجھی ہوئی تھی۔ تو ان تینوں سے ایک ہی بات ثابت ہوتی ہے یعنی یہ کہ حقیقتاً نیک لوگ دوزخ میں داخل نہ ہوں گے۔ اور یہی قرآن کریم کی تعلیم ہے۔ کیونکہ فرمایا ﴿لَا يَسۡمَعُوۡنَ حَسِيۡسَهَا﴾ [الأنبیآء: 102:21] وہ اس کی آواز تک کو نہ سنیں گے اور ﴿اُولٰٓئِكَ عَنۡهَا مُبۡعَدُوۡنَ﴾ [الأنبیآء: 101:21] وہ اس سے دور رکھے جائیں گے۔ پس اگر یہاں وَرُوْدٌ میں نیک و بد دونوں شامل بھی سمجھے جائیں تو یہ وہ وَرُوْدٌ ہے جس کے ساتھ دخول نہیں۔ لیکن اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ یہاں مِنۡكُمۡ میں خطاب صرف کفار کو ہے۔ اور شروع رکوع سے ہی ذکر کفار کا ہے۔ مثلاً [آیت نمبر: 66] میں انسان کا لفظ عام ہے مگر مراد صرف وہی انسان ہے جو منکر بعث ہے۔ پھر [آیت نمبر: 68] میں انہی منکران بعث اور شیاطین کے حشر کا ذکر ہے۔ پس مِنۡكُمۡ میں یہی لوگ داخل ہیں اور یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے منقول ہے۔ (ج) اور بعض نے کہا کہ مومن کا ورود بھی گو شامل ہے مگر اس سے مراد مصائب و تکالیف ہیں جو اس دنیا میں مومن پر آتی ہیں۔ اور یہ مجاہد کی طرف منسوب ہے۔ (ج) اور اس کے آگے جو آتا ہے ﴿ثُمَّ نُنَجِّى الَّذِيۡنَ اتَّقَوۡا﴾ تو یہاں ثُمَّ ترتیب کے لیے نہیں [آیت نمبر: 44] بلکہ یہ ایک الگ واقعہ کا ذکر ہے کہ متقی نجات پا جائیں گے۔ یعنی عذاب سے بچ جائیں گے اور ظالم دوزخ میں رہیں گے۔

اور یہ جو بعض آثار میں صحابہ کے ایسے اقوال پائے جاتے ہیں کہ وہ اس آیت سے بہت خائف رہتے تھے۔ تو ان سے مراد یہ ہو سکتی ہے کہ ایک نہ ایک رنگ میں ہر انسان کو مصائب برداشت کرنی پڑتی ہیں اور مقامات عالیہ بغیر تکالیف شاقہ میں

ثُمَّ نُنَجِّی الَّذِیۡنَ اتَّقَوۡا وَّ نَذَرُ الظّٰلِمِیۡنَ فِیۡهَا جِثِیًّا ﴿۷۲﴾

پھر ہم انہیں بچالیں گے جنہوں نے تقویٰ اختیار کیا اور ہم ظالموں کو اس میں گھٹنوں پر گرا ہوا چھوڑ دیں گے۔

وَ اِذَا تُتۡلٰی عَلَیۡهِمۡ اٰیٰتُنَا بَیِّنٰتٍ قَالَ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا لِلَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡۤا ۙ اَیُّ الۡفَرِیۡقَیۡنِ خَیۡرٌ مَّقَامًا وَّ اَحۡسَنُ نَدِیًّا ﴿۷۳﴾

اور جب ہماری کھلی کھلی آیات ان پر پڑھی جاتی ہیں تو کافر مومنوں سے کہتے ہیں، دونوں فریق میں سے کس کا مقام اچھا ہے اور کس کی مجلس زیادہ خوبصورت ہے۔ (2024)

وَ کَمۡ اَهۡلَکۡنَا قَبۡلَهُمۡ مِّنۡ قَرۡنٍ هُمۡ اَحۡسَنُ اَثَاثًا وَّ رِءۡیًا ﴿۷۴﴾

اور کتنی نسلیں ہم نے ان سے پہلے ہلاک کیں جو سامان اور حسن منظر میں ان سے اچھی تھیں۔ (2025)

قُلۡ مَنۡ کَانَ فِی الضَّلٰلَةِ فَلۡیَمۡدُدۡ لَهُ الرَّحۡمٰنُ مَدًّا ۚ حَتّٰۤی اِذَا رَاَوۡا مَا یُوۡعَدُوۡنَ اِمَّا الۡعَذَابَ وَ اِمَّا السَّاعَةَ ؕ

کہہ جو کوئی گمراہی میں رہتا ہے تو رحمٰن اس کے لیے مہلت بڑھاتا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ جب وہ دیکھیں گے جس کا انہیں وعدہ دیا جاتا ہے، خواہ وہ عذاب اور خواہ وہ (موعود)

پڑنے کے میسر ہی نہیں آ سکتے۔ تو گویا یہ تکالیف بھی بظاہر ایک رنگ دوزخ کا ہی رکھتی ہیں۔ لیکن مومن کے لیے وہ ہر دو سلام بن جاتی ہیں۔

2024- نَدِیّ۔ نِدَاءٌ آواز کا دینا ہے۔ اسی سے نَدِیّ اور نَادِیٌ مجلس کو کہتے ہیں اور نادِی ہم نشین کو بھی کہتے ہیں۔ ﴿فَلۡیَدۡعُ نَادِیَهٗ﴾ [العلق: 17:96] ''سو وہ اپنے اہل مجلس کو بلا لے۔'' ﴿وَ تَاۡتُوۡنَ فِیۡ نَادِیۡکُمُ الۡمُنۡکَرَ﴾ [العنکبوت: 29:29] ''اور اپنی مجلس میں برے کام کرتے ہو۔'' اور اسی سے مکہ کا دارالندوہ ہے جہاں لوگ بڑے بڑے مشوروں کے لیے اکٹھے ہوتے تھے۔ (غ)

مجلس کی خوبصورتی پر جس قدر فخر عیسائی اقوام کو ہوا ہے اور کسی قوم کو نہیں ہوا۔ اس لیے کہ ان کی عورتیں آرائش کے سامان سے مزین ہو کر ان کی مجالس کی زینت بنتی ہیں۔

2025- ﴿رِءۡیًا﴾۔ [اَلَّذِیۡ یَرۡمَقُ مِنَ الۡحُسۡنِ بِهٖ] (غ) وہ جس کی طرف اس کے حسن کی وجہ سے نظر اُٹھے۔

یہاں انہی اعدائے حق کے اثاث اور حسن منظر کا ذکر ہے۔ اَثَاث کے لیے [دیکھو نمبر: 1770] گھر کا سامان بھی ہو سکتا ہے اور

فَسَيَعۡلَمُوۡنَ مَنۡ هُوَ شَرٌّ مَّكَانًا وَّ اَضۡعَفُ جُنۡدًا ﴿۷۵﴾

گھڑی، تو جان لیں گے کس کی حالت بری ہے اور کس کا لشکر کمزور ہے۔ (2026)

وَ يَزِيۡدُ اللّٰهُ الَّذِيۡنَ اهۡتَدَوۡا هُدًى ؕ وَ الۡبٰقِيٰتُ الصّٰلِحٰتُ خَيۡرٌ عِنۡدَ رَبِّكَ ثَوَابًا وَّ خَيۡرٌ مَّرَدًّا ﴿۷۶﴾

اور اللہ انہیں ہدایت میں بڑھاتا ہے جو سیدھے رستہ پر چلتے ہیں اور باقی رہنے والے اچھے عمل تیرے رب کے نزدیک ثواب میں بہتر ہیں اور انجام میں خوب تر ہیں۔ (2027)

اَفَرَءَيۡتَ الَّذِىۡ كَفَرَ بِاٰيٰتِنَا وَ قَالَ لَاُوۡتَيَنَّ مَالًا وَّ وَلَدًا ؕ ﴿۷۷﴾

تو کیا تو نے اسے دیکھا جو ہماری آیتوں کا انکار کرتا ہے اور کہتا ہے مجھے (ہمیشہ) مال اور اولاد ملتے رہیں گے۔ (2028)

مال بھی اور گھر کے سامان میں سب فرنیچر اور لباس آ جاتا ہے۔ کون قوم اس کی مصداق ہے، یہ محتاج بیان نہیں۔ جو سامان اور لباس بادشاہوں اور امراء کو میسر نہ آتے تھے وہ اس قوم کے معمولی آدمیوں کے پاس موجود ہیں۔

2026- ﴿فَلۡيَمۡدُدۡ لَهُ الرَّحۡمٰنُ﴾ میں بتایا کہ عادت اللہ یہ ہے کہ ضال قوم کو مہلت زیادہ دیتا ہے اور ﴿اِمَّا الۡعَذَابَ وَ اِمَّا السَّاعَةَ﴾ میں چھوٹے عذاب اور ساعت وسطیٰ یعنی قوم کی تباہی کا وقت مراد ہیں۔ کیونکہ آگے لشکر کی کمزوری کا ذکر ہے۔ اور تباہی سے مراد ان کے ساز و سامان کا چھن جانا ہے۔ [دیکھو نمبر: 2030] اس سورت میں لفظ رحمٰن کو بڑی کثرت سے دہرایا ہے۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ یہ سورت عیسائیت پر اتمام حجت کے طور پر ہے۔ اور عیسائیت نے صفت رحمانیت کا مطلق انکار کیا اور رحم بلا بدل کو اللہ تعالیٰ کی صفات کے خلاف قرار دے کر بیٹے کی قربانی کو گنہگاروں کی بخشش کا بدل ٹھہرایا ہے۔ گویا اللہ تعالیٰ کوئی گناہ بخش نہیں سکتا جب تک اس کا بدلہ نہ لے لے اور یہ اس کی صفت رحمانیت کے خلاف ہے۔ [دیکھو صفحہ: 3] فاتحہ میں عقائد باطلہ کی تردید۔

2027- مَّرَدًّا۔ مَرَدَّ کی طرح مصدر ہے اور اس کے اصل معنی صَرَفَ یا پھیرنا ہیں۔ ﴿فَلَا مَرَدَّ لَهٗ﴾ [الرعد: 11:13] ''تو وہ کسی طرح رد نہیں ہو سکتی۔'' اور یہاں مراد مَرجِع اور عاقبت ہے۔ (ر)

انسان کو اللہ تعالیٰ نے ایسا ہی بنایا ہے کہ جب وہ غلطی کی طرف قدم اٹھاتا ہے تو ادھر ہی اس کا قدم اٹھتا چلا جاتا ہے۔ جب نیکی اور ہدایت کی طرف قدم اٹھاتا ہے، اسی میں ترقی کرتا چلا جاتا ہے۔ اسی لیے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ انہیں ہدایت میں بڑھاتا ہے۔

اَطَّلَعَ الۡغَيۡبَ اَمِ اتَّخَذَ عِنۡدَ الرَّحۡمٰنِ عَهۡدًا ﴿۷۸﴾

کیا اسے غیب کی اطلاع ہے یا اس نے رحمٰن سے کوئی اقرار لے لیا ہے۔

كَلَّا ؕ سَنَكۡتُبُ مَا يَقُوۡلُ وَ نَمُدُّ لَهٗ مِنَ الۡعَذَابِ مَدًّا ﴿۷۹﴾

ہرگز نہیں ہم لکھ لیں گے جو وہ کہتا ہے اور اس کے لیے عذاب کو بڑھاتے چلے جائیں گے۔ (2029)

وَّ نَرِثُهٗ مَا يَقُوۡلُ وَ يَاۡتِيۡنَا فَرۡدًا ﴿۸۰﴾

اور ہم اس چیز کے وارث ہوں گے جو وہ کہتا ہے اور وہ اکیلا ہمارے پاس آئے گا۔ (2030)

وَ اتَّخَذُوۡا مِنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ اٰلِهَةً لِّيَكُوۡنُوۡا لَهُمۡ عِزًّا ﴿۸۱﴾

اور وہ اللہ کے سوائے اور معبود بناتے ہیں تاکہ ان کے لیے قوت کا موجب ہوں۔

كَلَّا ؕ سَيَكۡفُرُوۡنَ بِعِبَادَتِهِمۡ وَ يَكُوۡنُوۡنَ عَلَيۡهِمۡ ضِدًّا ﴿۸۲﴾ ع 5 17 8

ایسا نہ ہوگا، وہ ان کی عبادت کا انکار کریں گے اور ان کے مخالف ہوں گے۔ (2031)

2028- ﴿لَاُوۡتَيَنَّ مَالًا وَّ وَلَدًا﴾ کہنے والا پہلے ہی صاحب مال وولد ہے۔ پس یہاں مراد ایتائے مستمر ہے یعنی یہ چیزیں ہمیشہ ہی مجھے ملتی رہیں گی گویا یہ ایک انسان کا کہنا نہیں بلکہ ایک قوم کا کہنا ہے جو اپنے مال وولد پر فخر کرتی ہے اور سمجھتی ہے کہ وہ ہمیشہ کے لیے دنیا کے اموال اور بڑے جتھے کی مالک ہوگئی ہے۔

2029- ﴿سَنَكۡتُبُ﴾ یعنی جو کچھ وہ کہتا رہتا ہے ہم اسے لکھتے رہیں گے۔ یہاں بھی پچھلی آیت کی طرح استمرار ہے۔

2030- ﴿مَا يَقُوۡلُ﴾ سے مراد وہی مال وولد ہے جس پر وہ فخر کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ کے اس کے وارث ہونے سے مراد یہ ہے کہ وہ مال اس سے لے لیا جائے گا۔ موت کے وقت تو ہوتا ہی ہے۔ مگر یہاں قومی حالت کا ذکر ہے مال اور جتھے کی مالک دنیا میں کبھی ایک قوم ہوتی ہے، کبھی دوسری۔ اور جس قوم کو اپنے مال اور جتھے پر فخر ہو اس کا اس سے چھن جانا اس پر سخت ترین عذاب بلکہ اس کی ہلاکت ہے۔

2031- ﴿ضِدًّا﴾۔ ضِدّ ایک چیز کی وہ ہے کہ ایک آئے تو دوسری چلی جائے، جیسے رات اور دن اور جو چیز دوسری کے خلاف ہو اسے بھی اس کی ضد کہا جاتا ہے اور عکرمہ سے یہاں ضد کے معنی اعدا مروی ہیں۔ (ل)

اَلَمۡ تَرَ اَنَّاۤ اَرۡسَلۡنَا الشَّيٰطِيۡنَ عَلَى الۡكٰفِرِيۡنَ تَؤُزُّهُمۡ اَزًّا ﴿۸۳﴾

کیا تو نے غور نہیں کیا کہ ہم نے شیطانوں کو کافروں پر چھوڑ رکھا ہے جو انہیں اکساتے رہتے ہیں۔ (2032)

فَلَا تَعۡجَلۡ عَلَيۡهِمۡ ؕ اِنَّمَا نَعُدُّ لَهُمۡ عَدًّا ﴿۸۴﴾

سو تو ان پر (عذاب کے لیے) جلدی نہ کر، ہم صرف ان (کے دنوں) کی گنتی ان کے لیے پوری کر رہے ہیں۔

پچھلی آیت میں فرمایا تھا کہ یہ دوسرے معبود اس لیے بناتے ہیں کہ ان کے لیے قوت کا موجب ہو۔ اور اس آیت میں پہلے فرمایا کہ ایسا نہیں ہوگا۔ اور پھر فرمایا کہ وہ ان کی عبادت کا انکار کریں گے۔ یعنی جنہیں معبود بنایا تھا وہ نہ صرف ان کی قوت کا موجب نہ ہوں گے بلکہ ان کی عبادت کا انکار کریں گے۔ جیسا کہ فرمایا ﴿مَا كَانُوۡۤا اِيَّانَا يَعۡبُدُوۡنَ﴾ [القصص: 63:28] ''یہ ہماری عبادت نہ کرتے تھے۔'' اور پھر اس سے بڑھ کر یہ فرمایا کہ وہ ان کے خلاف ہوں گے۔ یعنی ان کے خلاف شہادت ادا کریں گے۔ اور یہ لوگ ہیں جنہیں معبود بنایا گیا بالخصوص حضرت مسیح، جن کی قوم کا یہاں خاص ذکر ہے۔ یہاں پرستاروں کے انکار کا ذکر نہیں، بلکہ معبودین کے انکار کا ذکر ہے۔

2032- ﴿اَرۡسَلۡنَا﴾۔ اِرۡسَالٌ (بھیجنا) انسان کے لیے بھی ہوتا ہے اور پسندیدہ یا ناپسندیدہ چیزوں کے لیے بھی۔ کبھی تسخیر سے جیسے ﴿وَ اَرۡسَلۡنَا السَّمَآءَ عَلَيۡهِمۡ مِّدۡرَارًا﴾ [الأنعام: 6:6] ''اور ہم نے ان پر زور سے مینہ برساتا ہوا بادل بھیجا۔'' اور کبھی اس شخص کے بھیجنے سے ہوتا ہے جس کے لیے اختیار ہو ﴿وَ يُرۡسِلُ عَلَيۡكُمۡ حَفَظَةً﴾ [الأنعام: 61:6] ''اور تم پر نگہبان بھیجتا ہے۔'' ﴿فَاَرۡسَلَ فِرۡعَوۡنُ فِى الۡمَدَآئِنِ حٰشِرِيۡنَ ۚ﴾ [الشعرآء: 53:26] ''تو فرعون نے شہروں میں نقیب بھیجے۔'' اور کبھی تخلیہ اور ترک منع سے یعنی ایک چیز کو اس کی حالت پر چھوڑ دینا اور اسے نہ روکنا۔ جیسے یہاں (یعنی یہاں ﴿اَرۡسَلۡنَا الشَّيٰطِيۡنَ﴾ سے مراد ہے کہ ہم نے ان شیطانوں کو منع نہیں کیا اور وہ اپنا کام کرتے ہیں) اور ارسال اِمساک یعنی روک رکھنے کے مقابل پر ہے۔ ﴿مَا يَفۡتَحِ اللّٰهُ لِلنَّاسِ مِنۡ رَّحۡمَةٍ فَلَا مُمۡسِكَ لَهَا ۚ وَ مَا يُمۡسِكۡ ۙ فَلَا مُرۡسِلَ لَهٗ مِنۡۢ بَعۡدِهٖ﴾ [فاطر: 2:35] ''اللہ جو رحمت لوگوں کے لیے کھولے تو اس کو بند کرنے والا کوئی نہیں اور جسے وہ بند کر دے تو اس کے بعد اسے کھولنے والا نہیں۔''

﴿تَؤُزُّ﴾۔ اَزَّ ہانڈی کے اُبال پر بولا جاتا ہے جب وہ جوش میں ہو، اور یہ ھَزَّ یعنی ہلانے سے بڑھ کر ہے۔ (غ) اور اَزَّ کے معنی اختلاط یعنی ملا دینا اور تَہۡیِیۡجَ یعنی اُبھارنا اور اِغۡرَاء یعنی اُکسانا بھی آتے ہیں اور حرکت شدید بھی اس کے معنی ہیں۔ (ل)

یہاں شیاطین سے مراد بھی سردار ہیں جن کا ذکر ﴿اَيُّهُمۡ اَشَدُّ عَلَى الرَّحۡمٰنِ عِتِيًّا﴾ [69] میں ابھی ہو چکا ہے۔ گویا ان کے بڑے بڑے سردار کفار کو انگیخت کرتے اور اکساتے رہتے ہیں تاکہ وہ حق کی مخالفت میں لگے رہیں۔ اسی لیے اگلی آیت میں فرمایا کہ ان کے لیے عذاب کی جلدی مت کر، کیونکہ ان کی گنتی کے دن تو پورے ہونے ہی ہیں۔ گویا ان کا جرم کسی قدر ہلکا کیا ہے۔ اسی لیے پیچھے آیا تھا ﴿فَلۡيَمۡدُدۡ لَهُ الرَّحۡمٰنُ مَدًّا﴾ [75] کسی قدر مہلت ان کی لمبی کی جاتی ہے۔ اس عام ذکر میں خاص

يَوۡمَ نَحۡشُرُ الۡمُتَّقِيۡنَ اِلَى الرَّحۡمٰنِ وَفۡدًا ﴿۸۵﴾

جس دن ہم متقیوں کو رحمٰن کی طرف ایک عزت والے گروہ کے طور پر اکٹھا کریں گے۔ (2033)

وقف لازم

وَّنَسُوۡقُ الۡمُجۡرِمِيۡنَ اِلٰى جَهَنَّمَ وِرۡدًا ﴿۸۶﴾

اور مجرموں کو ہم جہنم کی طرف (پیاسے جانوروں کی طرح) ہانک لے جائیں گے۔ (2034)

لَا يَمۡلِكُوۡنَ الشَّفَاعَةَ اِلَّا مَنِ اتَّخَذَ عِنۡدَ الرَّحۡمٰنِ عَهۡدًا ﴿۸۷﴾

وقف لازم

وہ شفاعت کے مالک نہ ہوں گے، مگر جس نے رحمٰن سے عہد باندھا ہے۔ (2035)

وَقَالُوا اتَّخَذَ الرَّحۡمٰنُ وَلَدًا ﴿۸۸﴾

اور کہتے ہیں رحمٰن نے بیٹا بنایا۔

اشارہ اس قوم کی طرف ہے جس کا ذکر ابھی آتا ہے ﴿وَ قَالُوا اتَّخَذَ الرَّحۡمٰنُ وَلَدًا﴾ [88] جو اس سورت میں بالخصوص مخاطب رہی ہے اور اگر وہ شیاطین مراد لیے جائیں جو قرین انسان ہیں تو گناہوں پر ابھارنا مراد ہے۔ اس صورت میں بھی شیطان کا کام صرف تحریک کرنا ہی بتایا ہے۔ ہاں اسے زور کی تحریک کہا ہے اور ﴿اَرۡسَلۡنَا﴾ کی تشریح اوپر ہو چکی، شیطان کا کام بدی کی تحریک ہے سو اللہ تعالیٰ اسے ایسا کرنے سے منع نہیں کرتا مگر شیطان کا تسلط انسان پر کوئی نہیں۔

2033- ﴿وَفۡدًا﴾۔ وَفد اصل میں وہ لوگ ہیں جو بادشاہوں کے پیش کیے جاتے ہیں تاکہ حوائج کو پیش کریں۔ (غ) یا معزز سوار۔ (غ)

2034- ﴿وِرۡدًا﴾۔ وِرۡدٌ۔ وَرُوۡدٌ کے معنی میں بھی آتا ہے یعنی لوگوں کا پانی پر جانا اور اس پانی کو بھی کہتے ہیں جس پر جائیں اور ان اونٹوں کو بھی جو جائیں اور پیاس کو بھی۔ (ل) ﴿بِئۡسَ الۡوِرۡدُ الۡمَوۡرُوۡدُ﴾ [هود: 98:11] ''کیا ہی بری گھاٹ ہے جس پر پہنچے۔'' یہاں لفظ وِرۡدٌ میں لطیف پیاس کا اشارہ ہے کہ پیاسا تو پانی پر پیاس بجھانے کے لیے جاتا ہے مگر ان کی پیاس بجھانے کا سامان بھی آگ ہی ہوگی۔ بالفاظ دیگر وہ روحانی پیاس جو انہوں نے اپنے افعال سے پیدا کی ہے پانی سے نہیں بلکہ آگ سے بجھ سکتی ہے۔

2035- **مومنوں کا شفاعت کرنا:** ﴿مَنِ اتَّخَذَ عِنۡدَ الرَّحۡمٰنِ عَهۡدًا﴾ سے مراد یہاں شفیع بھی ہو سکتا ہے اور مشفوع بھی۔ شفیع کی صورت میں مراد کامل الایمان لوگ ہیں جنہوں نے اللہ تعالیٰ کے عہد کو مضبوط پکڑا یعنی اس کے احکام پر عمل کیا اور مقامات عالیہ حاصل کیے۔ پس کامل الایمان مومن دوسرے مومنوں کے لیے شفیع ہو جائیں گے۔ اور مشفوع کی صورت میں مراد یہ ہے کہ

لَقَدۡ جِئۡتُمۡ شَيۡـًٔا اِدًّا ﴿۸۹﴾ یقیناً تم ایک خطرناک بات کر گزرے۔ (2036)

تَكَادُ السَّمٰوٰتُ يَتَفَطَّرۡنَ مِنۡهُ وَ تَنۡشَقُّ الۡاَرۡضُ وَ تَخِرُّ الۡجِبَالُ هَدًّا ﴿۹۰﴾ قریب ہے کہ آسمان اس سے پھٹ پڑیں اور زمین شق ہو جائے اور پہاڑ ریزہ ریزہ ہو کر گر جائیں۔ (2037)

اَنۡ دَعَوۡا لِلرَّحۡمٰنِ وَلَدًا ﴿۹۱﴾ کہ وہ رحمٰن کے لیے بیٹے کا دعویٰ کرتے ہیں۔

وَ مَا يَنۡۢبَغِىۡ لِلرَّحۡمٰنِ اَنۡ يَّتَّخِذَ وَلَدًا ﴿۹۲﴾ اور رحمٰن کو تو شایاں نہیں کہ وہ بیٹا بنائے۔

شفاعت ان کے حق میں ہوگی جنہوں نے رحمٰن سے عہد باندھا ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو شریک نہیں ٹھہرایا۔ یا یہ کہ اللہ تعالیٰ کی شرائع کو انہوں نے قبول کیا مگر کسی وجہ سے کچھ نقص ان کے عمل میں رہ گیا، بہرحال یہ ضروری ہے کہ شفیع کے ساتھ تعلق قائم کیا ہو اور یہ شفاعت صلحاء اور انبیاء کی ہے۔ اللہ تعالیٰ تمام شفاعتوں کے بعد بھی لوگوں کو جہنم سے باہر نکال دے گا۔ اور بعض نے عہد سے مراد یہاں امر اور اذن لیا ہے۔

2036- ﴿اِدًّا﴾ وہ امر ہے جس کی برائی حد سے گزری ہوئی ہو اور وہ بڑی بھاری بات ہو یا بڑی مصیبت کی بات۔ (ل)

یہاں صاف طور پر بتا دیا کہ وہ کون سی قوم ہے جس کا خاص ذکر اس سورت میں چلا آتا ہے اور جس کے سامانوں اور آرائشوں اور حسن منظر کا ذکر تھا۔ یہ وہ قوم ہے جنہوں نے عقیدۂ ابنیت کو دنیا میں پھیلایا۔ گو مفسرین نے یہاں عیسائیوں کے ساتھ عزیر کو ابن اللہ کہنے والوں کو اور ملائکہ کو خدا کی بیٹیاں کہنے والوں کو بھی شامل کیا ہے۔ لیکن ان دونوں گروہوں کا وجود بھی دنیا میں باقی نہیں رہا۔ اور ﴿اتَّخَذَ الرَّحۡمٰنُ وَلَدًا﴾ کہنے والی ایک ہی قوم رہ گئی جنہوں نے عقیدۂ ابنیت کو دنیا میں پھیلا کر اپنے آپ کو ان آیات کا مصداق بنایا ہے اور اس آیت سے اور اس سے اگلی آیت سے صاف ظاہر ہے کہ یہ عقیدہ دنیا میں اس قدر زور پکڑنے والا تھا کہ قرآن کو اس قدر پُر ہیبت الفاظ میں اس کی تردید کرنی پڑی۔ بت پرستی، عناصر پرستی اور دیگر قسم کے شرک کے متعلق ایسے الفاظ نہیں فرمائے اور جِئۡتُمۡ سے مراد یہی ہے۔ [دیکھو نمبر: 1990] کہ ایک بات کا قصد کیا اور اسے کر گزرے اور یہ عقیدۂ ابنیت کے دنیا میں پھیلا دینے کی طرف اشارہ ہے۔

2037- ﴿يَتَفَطَّرۡنَ﴾۔ فَطَرٌ کے اصل معنی طول میں شق یعنی پھاڑ دینا ہیں۔ اور تَفَطَّر کے معنی تَشَقَّق یعنی پھٹ گیا ہیں۔

﴿هَدًّا﴾ سخت گرنے اور ٹوٹ جانے کو کہتے ہیں جیسے ایک چیز یک مرتبہ گر کر منہدم ہو جائے۔ (ل)

عقیدۂ ابنیت نظام عالم کو باطل کرتا ہے:

ان ہیبت ناک الفاظ میں صرف اس عقیدہ کی برائی کا اظہار ہی نہیں کیا بلکہ فی الواقع دنیا میں کوئی قانون باقی نہیں رہتا اور نہ خود

اِنۡ كُلُّ مَنۡ فِى السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ اِلَّاۤ اٰتِى الرَّحۡمٰنِ عَبۡدًا ﴿۹۳﴾

آسمانوں اور زمین میں جتنی چیزیں ہیں سوائے اس کے نہیں کہ وہ رحمٰن کے پاس غلام بن کر آئیں گی۔ (2038)

لَقَدۡ اَحۡصٰىهُمۡ وَ عَدَّهُمۡ عَدًّا ﴿۹۴﴾

اس نے ان کا احاطہ کرلیا ہے اور انہیں پورا پورا گن رکھا ہے۔

وَ كُلُّهُمۡ اٰتِيۡهِ يَوۡمَ الۡقِيٰمَةِ فَرۡدًا ﴿۹۵﴾

اور وہ سب کے سب قیامت کے دن اس کے پاس اکیلے اکیلے آئیں گے۔ (2039)

اِنَّ الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَيَجۡعَلُ لَهُمُ الرَّحۡمٰنُ وُدًّا ﴿۹۶﴾

وہ جو ایمان لاتے اور اچھے عمل کرتے ہیں رحمٰن ان کے لیے محبت پیدا کردے گا۔ (2040)

اس عالم کا وجود باقی رہتا ہے۔ بلکہ عالم بالا کا وجود بھی باقی نہیں رہتا۔ اگر اللہ تعالیٰ کا بیٹا مانا جائے، کیونکہ بیٹا مانا ہی اس بنا پر جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی صفات میں رحم بلا بدل نہیں۔ اگر اللہ تعالیٰ رحم بلا بدل بھی کرسکتا ہو تو اسے کسی بیٹے کی ضرورت نہیں جو انسانوں کے گناہوں کے لیے معاوضہ بنے۔ اور عیسائیت نے ابنیت اور کفارہ کی بنیاد ہی اسی بنیاد پر رکھی ہے کہ جب تک کوئی بدلہ نہ لے لے اس وقت تک وہ گناہوں کو معاف نہیں کرسکتا۔ اور انسان کی نجات ناممکن ہوجاتی ہے۔ تو اس لیے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اگر رحم بلا بدل اللہ تعالیٰ کی صفات میں سے ایک آن کے لیے بھی نکل جائے تو نہ آسمان باقی رہیں نہ زمین، نہ پہاڑ۔ خلق عالم اور نظام عالم کی بنیاد ہی رحم بلا بدل پر ہے۔ اسی سے معلوم ہوا کہ یہ عقیدہ دنیا میں نہیں رہ سکتا۔ ﴿وَ مَا يَنۡۢبَغِىۡ لِلرَّحۡمٰنِ اَنۡ يَّتَّخِذَ وَلَدًا ﴿۹۲﴾﴾ میں اس کو صاف بیان بھی کردیا ہے کہ اگر رحمانیت مانی جائے تو عقیدۂ ابنیت باقی نہیں رہ سکتا۔

2038- یعنی مخلوق کا کمال ہی عبد ہونے میں ہے۔ اسی لیے [مُحَمَّدًا عَبۡدُهٗ وَرَسُوۡلُهٗ] میں اصل عبدیت کو ہی رکھا ہے۔

2039- یعنی عابد اور معبود سب خدا کے حضور اپنی اپنی ذمہ داری کو لے کر آئیں گے۔

2040- یعنی پاک لوگوں کی محبت خود بخود دنیا میں پیدا ہوتی چلی جاتی ہے۔ جیسا کہ بخاری اور مسلم میں ہے کہ جب اللہ تعالیٰ اپنے کسی بندے سے محبت کرتا ہے تو پہلے ملائکہ میں اس کی محبت پیدا ہوتی ہے۔ پھر وہ محبت زمین میں پھیل جاتی ہے۔ اور یہ قانون بالکل صحیح۔ جتنے اللہ تعالیٰ کے بندے ہوئے ہیں ابتدا میں ان کی مخالفت بھی سخت ہوئی ہے۔ مگر آہستہ آہستہ ان کی محبت دنیا میں بڑھتی چلی جاتی ہے۔ اور یہاں شاید رسول اللہ ﷺ کی قبولیت کی طرف بھی اشارہ ہو کہ آپ کی محبت دنیا میں یوماً فیوماً

فَاِنَّمَا يَسَّرۡنٰهُ بِلِسَانِكَ لِتُبَشِّرَ بِهِ الۡمُتَّقِيۡنَ وَ تُنۡذِرَ بِهٖ قَوۡمًا لُّدًّا ﴿۹۷﴾

سو ہم نے اسے تیری زبان میں آسان کیا ہے تا کہ تو متقیوں کو اس کے ذریعہ سے خوشخبری دے اور ایک جھگڑالو قوم کو اس کے ساتھ ڈرائے۔ (2041)

وَ كَمۡ اَهۡلَكۡنَا قَبۡلَهُمۡ مِّنۡ قَرۡنٍ ؕ هَلۡ تُحِسُّ مِنۡهُمۡ مِّنۡ اَحَدٍ اَوۡ تَسۡمَعُ لَهُمۡ رِكۡزًا ﴿۹۸﴾

اور ان سے پہلے ہم نے کتنی نسلیں ہلاک کر دیں کیا تو ان میں سے کسی کو دیکھتا ہے یا ان کی بھنک بھی سنتا ہے۔ (2042)

ع 6/16/9

ترقی کرتی جائے گی۔ چنانچہ آج ہم دیکھتے ہیں کہ وہی عیسائی جنہوں نے کسی زمانہ میں آنحضرت ﷺ کے متعلق ہر قسم کی بدزبانی کی اور غلطیوں کو پھیلایا، اب انہیں میں سے بہت سے دلوں میں آپ کی محبت پیدا ہوتی جا رہی ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ آخرکار یہ قوم بھی آپ کو قبول کرلے گی، اور عیسائیت پر اتمام حجت کے ذکر میں اس کو لانے سے اسی طرف اشارہ کرنا مقصود معلوم ہوتا ہے۔

2041- جن الفاظ سے سورۃ کہف کو شروع کیا تھا یعنی مومنوں کو بشارت اور ولد بنانے والوں کو انذار، انہی پر سورۃ مریم کا خاتمہ کیا ہے سوائے اس کے کہ یہاں [اِتِّخَاذِ وَلَدٌ] کی بجائے ان کا قوم لُدّ ہونا بیان کیا ہے۔ اس لیے کہ جس قدر جھگڑا اس قوم نے حق کے ساتھ کیا ہے اور کسی نے نہیں کیا۔

2042- ﴿رِكۡزًا﴾۔ صوت خفی یعنی ہلکی آواز کو کہتے ہیں۔ (غ)

قوموں کی ہلاکت کا اٹل قانون:

اللہ تعالیٰ نے اپنے اس اٹل قانون کی طرف توجہ دلائی ہے کہ کس طرح قومیں دنیا میں بڑھتی اور ترقی کرتی ہیں۔ پھر ان پر وہ وقت آتا ہے کہ ان کی صف لپیٹ لی جائے، یہاں تک کہ ان کا نام ونشان مٹ جاتا ہے۔ ہاں حق ہی ایک چیز ہے جو دنیا میں رہ جاتی ہے اور اسے کوئی مٹا نہیں سکتا۔

سورۃ طٰہٰ

نام

اس سورت کا نام طٰہٰ ہے اور اس میں 8 رکوع اور 135 آیات ہیں۔ اس کا نام اس کے پہلے حروف سے لیا گیا ہے جن سے یہ سورت شروع ہوتی ہے۔ اور جن میں آنحضرت ﷺ کو مرد کامل کے نام سے خطاب کر کے یہ ظاہر کیا ہے کہ نور محمدی اپنے کمال کو پہنچ کر رہے گا گو ابتدا میں وہ ایک ہلال کی طرح نظر آئے، اور اسی کمال کا ذکر ہی اس سورت میں ہے۔ پس اس کا نام اس کے مضمون کو ظاہر کر دیتا ہے۔

خلاصہ مضمون:

① اس سورت کی ابتدا ہی کامیابی کی بشارت سے کی ہے۔ نہ صرف طٰہٰ کے لفظ میں آنحضرت ﷺ کے کمال کی طرف اشارہ کر کے بلکہ اس کے ساتھ ہی صریح الفاظ میں یہ بتا کر کہ قرآن جیسی کتاب نازل کر کے یہ نہیں ہوسکتا کہ اس کا مہبط دنیا میں ناکام رہے، وہ ضرور کامیاب ہوگا۔ پھر اس کے ساتھ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی بعثت کا ذکر کیا جس کی غرض بھی یہی بتانا ہے کہ باوجود ساری مشکلات کے جس طرح نور موسوی کمال کو پہنچا اسی طرح نور محمدی بھی ضرور ہے کہ اپنے کمال کو پہنچ کر رہے۔

② حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ذکر کو جاری رکھتے ہوئے دوسرے رکوع میں ان کے اور حضرت ہارون علیہ السلام کے فرعون کی طرف جانے کا،

③ تیسرے میں ان کے ساحروں سے مقابلہ کا اور

④ چوتھے میں فرعون کی ہلاکت کا ذکر کیا اور اس کامیابی کے بعد بتایا کہ بنی اسرائیل اپنے مقام بلند سے گر کر عجل پرستی میں پڑ گئے۔

⑤ اور پانچویں رکوع میں عجل پرستی کے انجام کا ذکر کیا اور یوں مسلمانوں کو بتایا کہ اگر وہ بھی بنی اسرائیل کی طرح زینت دنیوی کے ظاہری سامانوں پر گر گئے تو یہ بات ان کے حصول مقصد میں روک ہو جائے گی۔

⑥ چھٹے رکوع میں ذکر قیامت میں بتایا کہ بڑی بڑی روکیں آخر دور ہو جائیں گی اور وہ انسان اور قومیں جو پہاڑوں کی طرح نظر آتی ہیں وہ بھی آخر رجوع الی الحق کریں گی۔

⑦ ساتویں رکوع میں بتایا کہ حق و باطل کا مقابلہ ہمیشہ سے ہی رہا ہے اور حق ہی آخر کار غالب آیا کرتا ہے۔ اور اس کو آدم اور شیطان کے قصہ سے واضح کیا۔

⑧ آٹھویں رکوع میں بتایا کہ حق کی آخری کامیابی اور مجرموں کی سزا دونوں امور یقینی ہیں، یہ ہو کر رہیں گے۔ اور یہ بھی بتایا کہ اس عذاب کی جو نبی کریم ﷺ کے مخالفین پر آئے گا نوعیت کیا ہوگی۔

تعلق:

پچھلی سورت میں عیسائیت کے عقائد باطلہ کی تردید کی تھی اور بتایا تھا کہ یہ عقیدہ ابنیت مسیح جس سے اسلام کو مقابلہ کرنا پڑے گا دنیا میں باقی نہیں رہ سکتا اور سورت کے آخری رکوع میں اشارہ کیا تھا کہ رسول اللہ ﷺ کی محبت آخر کار دنیا میں پھیل جائے گی۔اس سورت میں اس مضمون کی زیادہ توضیح کی ہے اور بتایا ہے کہ قرآن کا لانے والا دنیا میں کبھی ناکام نہیں رہ سکتا۔اور نہ اس کے مخالف اس عذاب ہلاکت سے بچ سکتے ہیں جو پہلے مکذبین پر آتا رہا۔ہاں یہاں اس کی نوعیت بھی بتادی۔

زمانہ نزول:

یہ سورت مکی ہے اور اس کا نزول بھی ابتدائی زمانہ سے ہی تعلق رکھتا ہے۔دیکھو بنی اسرائیل کے زمانہ نزول پر نوٹ۔اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اسلام کی تاریخ میں صاف آتا ہے کہ یہی وہ سورت تھی جس کو سن کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کانپ اٹھے اور قاتلانہ ارادہ کو چھوڑ کر غلامی کی حیثیت میں دربار نبوی میں جا حاضر ہوئے۔یہ بھی اس واقعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ سورت اس وقت لکھی ہوئی موجود تھی۔پس اس کا نزول بھی پانچویں سال بعثت کے قریب قریب کا ہے۔

اٰیَاتُهَا 135 (20) سُوۡرَۃُ طٰهٰ مَکِّیَّۃٌ (45) رُکُوۡعَاتُهَا 8

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ	اللہ بے انتہا رحم والے بار بار رحم کرنے والے کے نام سے
طٰهٰ ۚ ①	اے مرد (کامل)۔ (2043)
مَاۤ اَنۡزَلۡنَا عَلَیۡکَ الۡقُرۡاٰنَ لِتَشۡقٰۤی ۙ ②	ہم نے تجھ پر قرآن اس لیے نہیں اتارا کہ تو ناکام رہے۔ (2044)
اِلَّا تَذۡکِرَۃً لِّمَنۡ یَّخۡشٰی ۙ ③	بلکہ یہ اس کے لیے کہ نصیحت ہے جو ڈرتا ہے۔
تَنۡزِیۡلًا مِّمَّنۡ خَلَقَ الۡاَرۡضَ وَ السَّمٰوٰتِ الۡعُلٰی ؕ ④	اس کی طرف سے اتارا گیا ہے جس نے زمین اور بلند آسمانوں کو پیدا کیا۔ (2044) ل

2043- ﴿طٰهٰ﴾۔ بعض لغتوں میں یا رجل کی جگہ بولا جاتا ہے یعنی اے مرد۔ (ج) اور اس کے تکرہ رکھنے میں عظمت اور کمال کی طرف اشارہ ہے اور روح المعانی میں باب الاشارہ میں ہے کہ طٰہٰ کے عدد چودہ ہیں اور یہ مرتبہ بدریہ کی طرف اشارہ ہے۔ (ر) یا یہ کہ نور محمدی جس کا انکار کیا جائے گا چودھویں کے چاند کی طرح اپنے کمال کو پہنچے گا۔ اور یہ عجیب بات ہے کہ وہ حق جو شروع میں ایک ہلال کی طرح تھا ٹھیک اپنے چودھویں سال میں یوں کمال کو پہنچا کہ اس کی قبولیت کو استحکام حاصل ہوا اور اس کے مخالفوں کی قوت وشوکت ٹوٹ گئی۔ کیا عجب ہے کہ چودھویں صدی میں پھر ایک دفعہ یہ نور محمدی جس کے مٹانے کی کوشش کی گئی ہے از سرنو بدر ہو کر چمکے۔ ﴿وَ الۡقَمَرَ قَدَّرۡنٰهُ مَنَازِلَ حَتّٰی عَادَ کَالۡعُرۡجُوۡنِ الۡقَدِیۡمِ ۝﴾ [یٰسٓ: 39:36] ''اور چاند کے لیے ہم نے کئی منزلیں مقرر کر دیں یہاں تک کہ وہ پھر کھجور کی پرانی سوکھی شاخ کی طرح ہو جاتا ہے۔''

2044- شقاوۃ سعادت کی ضد ہے [دیکھو نمبر: 1504] اور اس کے معنی ہیں بھلائی کے پانے سے یا اعانت الٰہی سے محرومی۔ پس مراد یہ ہے کہ اتنی بڑی عظیم الشان اور کامل کتاب اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبر پر نازل کی ہے، تو یہ نہیں ہوسکتا کہ وہ پیغمبر اب اس غرض کے حصول میں ناکام رہے جس کے لیے وہ کتاب نازل کی گئی ہے۔ بالفاظ دیگر کتاب اس لیے نازل کی ہے کہ تم مخلوق الٰہی کو ہدایت پر لا سکو، اس لیے لازمی ہے کہ تم کامیاب بھی ہو۔ چونکہ پچھلی سورت کے آخر پر ایک سخت جھگڑالو قوم کا ذکر کیا تھا، اس لیے اب تشفی دیتا ہے کہ اس کتاب کے ذریعہ سے آخر دنیا ہدایت کو قبول کرے گی۔

2044ل- الۡعُلٰی۔ عُلۡیَا کی جمع ہے اور عُلۡیَا اَعۡلٰی کی تانیث ہے اور یہاں مراد ہے کہ اس عالم کی نسبت وہ اشرف اور افضل ہیں۔ (غ)

اَلرَّحْمٰنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰى ۝۵

وہ رحمٰن (ہے جو) عرش پر قائم ہے۔

لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِي الْاَرْضِ وَ مَا بَيْنَهُمَا وَ مَا تَحْتَ الثَّرٰى ۝۶

اسی کے لیے ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے اور جو ان دونوں کے درمیان ہے اور جو گیلی مٹی کے نیچے ہے۔ (2045)

وَ اِنْ تَجْهَرْ بِالْقَوْلِ فَاِنَّهٗ يَعْلَمُ السِّرَّ وَ اَخْفَى ۝۷

اور اگر تو پکار کر بات کہے تو وہ بھید کو اور اس سے مخفی بات کو بھی جانتا ہے۔ (2046)

اَللّٰهُ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ؕ لَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى ۝۸

اللہ، اس کے سوائے کوئی معبود نہیں، اچھے نام اسی کے ہیں۔

وَ هَلْ اَتٰىكَ حَدِيْثُ مُوْسٰى ۝۹ۘ

وقف لازم

اور کیا تجھے موسیٰ کی خبر پہنچی ہے؟ (2047)

اِذْ رَاٰ نَارًا فَقَالَ لِاَهْلِهِ امْكُثُوْۤا

جب اسے آگ دکھائی دی تو اس نے اپنے گھر والوں

2045- الثَّرٰی۔ اصل میں گیلی مٹی کو کہتے ہیں۔ حدیث میں ہے کہ [فَإِذَا كَلْبٌ يَلْهَثُ يَأْكُلُ الثَّرَى مِنَ الْعَطَشِ] (صحيح البخاری، كتاب المظالم، باب الآبَارِ عَلَى الطُّرُقِ إِذَا لَمْ يُتَأَذَّ بِهَا، حديث: 2466) [دیکھو نمبر: 6009] ایک کتا پیاس کی وجہ سے گیلی مٹی چاٹ رہا تھا۔ (ل) اور اسی مادہ سے ثَرْوَتٌ ہے جو کثرت کو کہتے ہیں۔ اور ثُرَيَّا کو اکب میں سے ہے۔ (ل) پس ﴿تَحْتَ الثَّرٰى﴾ سے مراد ہے زمین کے اندر اور مفسرین نے کہیں ساتویں زمین اور کہیں صَخْرَةٌ مراد لیا ہے۔

2046- ﴿اَخْفٰى﴾ یعنی جو سرّ یا بھید سے بھی زیادہ مخفی ہے۔ مثلاً وہ خیال جو دل میں گزرے یا اس سے بھی مخفی جو ابھی انسان کے دل میں بھی نہیں آیا۔

2047- جب حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنے محدود پیغام کے ساتھ بھی ناکام نہیں رہے تو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کس طرح ناکام رہ سکتے ہیں۔ یہ اصل غرض معلوم ہوتی ہے جس کے لیے حضرت موسیٰ علیہ السلام کا ذکر یہاں شروع کیا ہے۔ اس سورت میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ذکر کو وحی کی ابتدا سے شروع کر کے ساری شریعت کے ان پر نازل ہونے تک پانچ رکوعوں میں بڑے بسط سے بیان کیا ہے۔ اور غالباً بلحاظ نزول یہ سب سے پہلی سورت ہے جس میں اس قدر بسط کے ساتھ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا ذکر ہے۔

اِنِّیۡۤ اٰنَسۡتُ نَارًا لَّعَلِّیۡۤ اٰتِیۡکُمۡ مِّنۡهَا بِقَبَسٍ اَوۡ اَجِدُ عَلَی النَّارِ هُدًی ۝۱۰

سے کہا ٹھہر جاؤ میں نے آگ دیکھی ہے، شاید میں تمہارے پاس اس میں سے (ایک) شعلہ لے آؤں یا (اسی) آگ پر رستہ پاؤں۔ (2048)

2048- قَبَسٍ۔ وہ ہے جو شعلہ سے یعنی جلتی ہوئی آگ میں سے لے لیا جائے۔ قَبَسٌ اور اِقْتِبَاسٌ اس کا طلب کرنا ہے۔ پھر علم اور ہدایت کے طلب کرنے پر استعارۃً بولا جاتا ہے۔ ﴿انْظُرُوْنَا نَقْتَبِسْ مِنْ نُّوْرِكُمْ﴾ [الحدید: 13:57] ''ہمارا انتظار کرو، ہم بھی تمہارے نور سے (روشنی) لیں۔''

یہاں حضرت موسیٰ علیہ السلام پر نزول وحی کی ابتدا کا ذکر کیا ہے اور جو کچھ یہاں فرمایا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت حضرت موسیٰ علیہ السلام سفر میں تھے اور آپ کے اہل آپ کے ساتھ تھے اور یہ سفر مدین سے مصر کی طرف واپسی کا تھا۔ جیسا کہ دوسری جگہ فرمایا ﴿فَلَبِثْتَ سِنِیْنَ فِیْۤ اَهْلِ مَدْیَنَ ۙ ثُمَّ جِئْتَ عَلٰی قَدَرٍ یّٰمُوْسٰی ۝﴾ [40]۔ اور طور کی جانب میں یہ واقعہ پیش آیا۔ ﴿فَلَمَّا قَضٰی مُوْسَی الْاَجَلَ وَ سَارَ بِاَهْلِهٖۤ اٰنَسَ مِنْ جَانِبِ الطُّوْرِ نَارًا﴾ [القصص: 29:28] ''سو جب موسیٰ نے مدت پوری کر لی اور اپنے گھر والوں کے ساتھ چلا، طور کی طرف سے آگ دیکھی۔'' انہوں نے آگ دیکھی۔ یہ آگ کیسی تھی؟ یہ تو اگلی آیت سے ثابت ہے کہ یہ وہ آگ نہ تھی جو جلانے کا کام دیتی ہے۔ روح المعانی میں ہے کہ آگ کو لوگوں نے چار قسم کہا ہے۔ ایک وہ جس میں نور ہے اور وہ جلاتی بھی ہے، جیسے اس دنیا کی آگ۔ اور ایک وہ جس میں نہ نور ہے نہ وہ جلاتی ہے، جیسے درختوں کی آگ۔ اور ایک وہ جس میں نور نہیں مگر وہ جلاتی ہے، جیسے جہنم کی آگ۔ اور ایک وہ جس میں نور ہے اور وہ جلاتی نہیں، جیسے وہ آگ جو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے دیکھی۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کا کشف:

اور غرائب القرآن میں ہے کہ اس بات میں اختلاف ہوا ہے کہ وہ چیز جو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے دیکھی تھی آگ تھی یا نہیں۔ اور پھر اس قول کو بیان کر کے کہ وہ آگ ہی تھی، ورنہ موسیٰ علیہ السلام اپنی خبر میں صادق نہیں ٹھہرتے۔ لکھا ہے کہ اگر وہ آگ سے مشابہ ہو تو بھی کذب لازم نہیں آتا۔ مگر میرے نزدیک یہاں رأیٰ کا مفہوم وہ نہیں جو خیال کیا گیا ہے۔ جب حضرت یوسف علیہ السلام نے کہا تھا۔ ﴿اِنِّیْ رَاَیْتُ اَحَدَ عَشَرَ كَوْكَبًا وَّ الشَّمْسَ وَ الْقَمَرَ رَاَیْتُهُمْ لِیْ سٰجِدِیْنَ﴾ [یوسف: 4:12] ''میں نے گیارہ ستاروں اور سورج اور چاند کو دیکھا، میں نے دیکھا کہ وہ مجھے سجدہ کرتے ہیں۔'' تو وہ کواکب اور سورج اور چاند تو اپنی جگہ پر ہی رہے تھے۔ پھر انبیاء علیہم السلام کی ایک رویت حالت منام میں ہے اور ایک رویت حالت کشف میں اور ایک حالت وحی میں اور ایک رویت عام واقعات کی، جیسے انسانوں میں۔ اب یہ رویت عام واقعات کی تو نہ تھی کیونکہ وہ آگ ایسی نہ نکلی جس میں سے حضرت موسیٰ علیہ السلام جلتی ہوئی لکڑی اٹھا لاتے۔ اور یہ حالت خواب بھی نہیں اور وحی کا نزول بھی ابھی آپ پر نہیں ہوا۔ پس یہ کشف کی حالت ہے اور کشف میں انسان حالت بیداری میں ایک واقعہ کو دیکھتا ہے مگر وہ واقعہ دوسرے عالم کا ہوتا ہے۔ اسی حالت کشف میں

فَلَمَّآ اَتٰىهَا نُوْدِيَ يٰمُوْسٰى ؕ﴿۱۱﴾ سو جب اس کے پاس آیا آواز آئی اے موسیٰ!

اِنِّيْٓ اَنَا رَبُّكَ فَاخْلَعْ نَعْلَيْكَ ۚ اِنَّكَ بِالْوَادِ الْمُقَدَّسِ طُوًى ؕ﴿۱۲﴾ میں تیرا رب ہوں، سو تو اپنی جوتیاں اتار دے تو پاک وادی طویٰ میں ہے۔ (2049)

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے آگ کو دیکھا اور یہ کہنا کہ اگر سچ مچ وہاں آگ نہ ہو تو خبر میں کذب لازم آتا ہے، صحیح نہیں۔ اس لیے خبر تو اس بات کی دی ہے کہ اس نے آگ دیکھی۔ سو اس کا دیکھنا بالکل حق تھا۔

﴿اَجِدُ عَلَى النَّارِ هُدًى﴾ کے معنی یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ وہاں کوئی رستہ بتانے والا مل جائے اور یہ بھی وہاں ہدایت دینی ملے۔ اسی دوسرے معنی کے قریب قریب معنی مجاہد اور قتادہ سے مروی ہیں۔ (ر) یہ دوسرے معنی ہی یہاں موزوں ہیں۔ گویا حضرت موسیٰ کو خود بھی ظن غالب یہ تھا کہ یہ کشفی نظارہ ہے۔ جہاں اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی ہدایت دینی ملنے والی ہے۔ اور میرے نزدیک [القصص: 29:28] میں خبر سے مراد بھی یہی ہے۔

2049- ﴿فَاخْلَعْ نَعْلَيْكَ﴾ ۔ خَلَعَ کے معنی ہیں اتار دینا اور نعل کے معنی جوتی۔ اور [رَجُلٌ فَاعِلٌ] اور مُنعَل غنی کو کہتے ہیں۔ جیسے حَافِرٌ (ننگے پاؤں والا) فقیر کو کہتے ہیں۔ (غ) اور ﴿فَاخْلَعْ نَعْلَيْكَ﴾ کے معنی دو طرح پر کیے گئے ہیں۔ یعنی ظاہر پر اس لحاظ سے کہ وہ مردہ گدھے کے چمڑے کی تھیں۔ اور بعض صوفیوں کا قول ہے کہ یہ ایک مثال ہے اور یہ امر ہے اقامت اور مضبوط ہو جانے کے لیے۔ جیسا کہ تم اس شخص کو جسے کہنا ہو کہ مضبوط ہو جاؤ کہتے ہو اپنے کپڑے اور موزے اتار لو۔ (غ) اور فعل سے وہ چیز بھی مراد لی جاتی ہے جو آرام کا موجب ہوں۔ اس لیے کہا گیا ہے کہ اس کے معنی ہیں اہل اور مال سے اپنے دل کو خالی کر دے۔ (ر)

﴿طُوًى﴾ طَوٰی (مصدر طَیّ) کے معنی ہیں لپیٹنا۔ ﴿يَوْمَ نَطْوِي السَّمَآءَ كَطَيِّ السِّجِلِّ لِلْكُتُبِ﴾ [الأنبيآء: 104:21] ''جس دن ہم آسمان کو لپیٹ لیں گے جس طرح تحریروں کا طومار لپیٹ لیا جاتا ہے۔'' اور یہاں طُوًی اس وادی کا نام بھی ہے اور کہا گیا ہے کہ یہ اس حالت کی طرف اشارہ ہے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کو طریق اجتباء پر حاصل ہوئی۔ گویا کہ اس پر مسافت لپیٹ لی گئی۔ اگر اجتہاد سے اس تک پہنچنا ہوتا تو وہ اس سے دور رہتے۔ (غ) اور بعض کے نزدیک طُوًی اور طِوًی کے ایک ہی معنی ہیں اور وہ وہ چیز ہے جو دہرائی گئی ہو۔ اور طُوًی کے معنی کیے گئے ہیں [طُوًی مَرَّتَين] یعنی دوبار پاک کی گئی۔ اور حسن کا قول ہے کہ اس میں برکت اور تقدیس دو چند کی گئی۔ (ل) اور بعض نے یہاں معنی لیے ہیں کہ اس کے رب نے اسے دوبار بلایا اور مجاہد نے دوبار پاک کی گئی اور برکت دی گئی معنی لیے ہیں۔ (ج) اور دوبار برکت سے مراد یہ معلوم ہوتی ہے کہ وہ پہلے بھی ارض مقدس یا مبارک سرزمین میں ہے اور پھر حضرت موسیٰ علیہ السلام کو وہاں وحی ملنے سے اس کی برکت دو چند ہو گئی۔

ظاہر ہے کہ جس کا ذکر پہلی آیت اور اس آیت میں ہے وحی الٰہی ہے ﴿اِذْ نَادٰىهُ رَبُّهٗ بِالْوَادِ الْمُقَدَّسِ طُوًى ۚ﴿۱۶﴾﴾ [النازعات:

وَ اَنَا اخۡتَرۡتُكَ فَاسۡتَمِعۡ لِمَا يُوۡحٰى ﴿۱۳﴾

اور میں نے تجھے چن لیا سو اسے سن جو وحی کی جاتی ہے۔ (2050)

اِنَّنِىۡۤ اَنَا اللّٰهُ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّاۤ اَنَا فَاعۡبُدۡنِىۡ ۙ وَ اَقِمِ الصَّلٰوةَ لِذِكۡرِىۡ ﴿۱۴﴾

میں اللہ ہوں میرے سوائے کوئی معبود نہیں، سو میری عبادت کر۔ اور میرے ذکر کے لیے نماز قائم کر۔

16:79] ''جب اس کے رب نے اسے وادی مقدس طویٰ میں پکارا'' اور پکارنے والا خود اللہ تعالیٰ ہے۔ وہ آواز کسی درخت کی نہیں اور ﴿اِنِّیۡۤ اَنَا رَبُّكَ﴾ سے بھی یہی ظاہر ہے اور وحی جس طرح پر انبیاء کو ہوتی ہے اسی طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ہوئی۔ اور بعض لوگوں نے جو یہاں پر بحث کی ہے کہ لفظ کوئی نہ تھے تو یہ صحیح نہیں۔ وحی متلو میں ہمیشہ لفظ ہوتے ہیں اور یہ سب سے اعلیٰ مرتبہ وحی کا ہے۔ البتہ وحی خفی میں ایک بات دل میں ڈالی جاتی ہے اس میں الفاظ نہیں ہوتے۔ اور جوتیاں اتارنے سے کیا مراد ہے؟ آیا ظاہری طور پر بلحاظ جگہ کی تقدیس کی ہے۔ اکثر مفسرین کا یہی خیال ہے، لیکن یہ یاد رکھنا چاہئے کہ جوتی میں رہ کر بھی اللہ تعالیٰ سے ہمکلامی ہو سکتی ہے جیسا کہ خود حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ہوئی۔ اور پاک جوتی ہو تو پاک جگہ پر اس کے جانے میں بھی کوئی حرج نہیں۔ جیسا کہ پاک جوتی کے ساتھ مسجد میں بھی جانا جائز ہے۔ اور درحقیقت اگر جوتی میں ہو کر اللہ تعالیٰ سے ہمکلامی کا مرتبہ حاصل ہو سکتا ہے تو کسی پاک مقام پر پاک جوتی کا جانا منع نہیں ہو سکتا۔ اس لحاظ سے دوسرے معنی جو اوپر دیئے گئے ہیں زیادہ موزوں ہیں۔ یعنی یا تو یہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو حکم ہے کہ وہ مضبوط ہو کر اس کام کو اختیار کریں اور یا یہ مطلب ہے کہ اب دنیا کے فکروں کو چھوڑ کر تبلیغ اختیار کریں۔ ورنہ وحی ہوتے ہوتے درمیان میں جوتیاں اتارنے کی بظاہر کوئی ضرورت نظر نہیں آتی۔ جیسا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم ہوا ﴿وَ ثِيَابَكَ فَطَهِّرۡ﴾ [المدثر: 4:74] ''اور اپنے کپڑوں کو پاک رکھ۔'' تو مراد اس سے عمل صالح کا کرنا یا تطہیر نفس ہے۔

2050- اخْتَرْتُكَ۔ اَخْتِیَارٌ سے ہے (مادہ خیر ہے) اور اَخْتِیَارٌ کے معنی ہیں اس کا طلب کرنا جو خیر ہے اور اس کا کرنا۔ اور کبھی اس پر بولا جاتا ہے جسے انسان خیر سمجھے گو وہ خیر نہ ہو۔ اور اللہ تعالیٰ کے اپنے بندوں کو اختیار کرنے میں جیسے یہاں اور ﴿اخْتَرْنٰهُمۡ عَلٰى عِلۡمٍ عَلَى الۡعٰلَمِيۡنَ﴾ [الدخان: 32:44] ''انہیں (اپنے) علم کی بنا پر قوموں پر برگزیدہ کیا۔'' میں۔ یہ بھی صحیح ہے کہ اشارہ ان کے نیک پیدا کرنے کی طرف ہے اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اشارہ یہ ہو کہ انہیں دوسروں پر مقدم کیا ہے۔ (غ) اور عرف متکلمین میں مُخْتَارٌ اس فعل کو کہا جاتا ہے جسے انسان مجبوری سے نہیں کرتا۔ اسی سے کہا جاتا ہے کہ فلاں شخص اسباب میں مختار ہے۔ (غ)

اِنَّ السَّاعَةَ اٰتِيَةٌ اَكَادُ اُخْفِيْهَا لِتُجْزٰى كُلُّ نَفْسٍ بِمَا تَسْعٰى ﴿۱۵﴾

وہ گھڑی ضرور آنے والی ہے میں اسے مخفی ہی رکھنا چاہتا ہوں تا کہ ہر نفس کو اس کے مطابق بدلہ دیا جائے جو وہ کوشش کرتا ہے۔(2051)

فَلَا يَصُدَّنَّكَ عَنْهَا مَنْ لَّا يُؤْمِنُ بِهَا وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ فَتَرْدٰى ﴿۱۶﴾

تجھے اس سے وہ شخص نہ روکے جو اس پر ایمان نہیں لاتا اور اپنی خواہش کے پیچھے چلتا ہے سو تو ہلاک ہو جائے۔(2052)

وَمَا تِلْكَ بِيَمِيْنِكَ يٰمُوْسٰى ﴿۱۷﴾

اور اے موسیٰ! یہ تیرے دائیں ہاتھ میں کیا ہے؟

قَالَ هِيَ عَصَايَ ۚ اَتَوَكَّؤُا عَلَيْهَا وَاَهُشُّ بِهَا عَلٰى غَنَمِيْ وَلِيَ فِيْهَا مَاٰرِبُ اُخْرٰى ﴿۱۸﴾

اس نے کہا یہ میرا عصا ہے میں اس پر سہارا لگاتا ہوں اور اس سے میں اپنی بکریوں کے لیے پتے جھاڑتا ہوں اور اس میں میرے لیے اور بھی فائدے ہیں۔(2053)

2051- **قیامت کا مخفی رکھنا:** اُخْفِيْ۔خَفٰى (يَخْفِي) کے معنی دونوں طرح پر آتے ہیں اور یہ اضداد میں سے ہے یعنی چھپایا اور ظاہر کیا۔لیکن اَخفَى (يُخْفِي) مصدر اِخفَاء کے معنی صرف چھپانا ہیں۔(ل) لیکن اَكَادُ یہاں بمعنی اُرِيدُ ہے۔بعض نے یہاں قراءت اَخْفِيْهَا لی ہے جس کے معنی اَظْهَرَهَا ہوں گے مگر ابوعلی نے اُخْفِيْهَا کے معنی بھی اَظْهَرَهَا لیے ہیں۔(د) ﴿اَكَادُ اُخْفِيْهَا﴾ جملہ معترضہ کے طور پر ہے۔یعنی وہ قیامت کبریٰ جو انسان کے اعمال کے جزا وسزا سے قائم ہوگی۔اس کو اللہ تعالیٰ انسان کی نظروں سے مخفی رکھتا ہے۔اس لیے کہ اعمال کی جزا سزا خود ایک مخفی چیز ہے جس کا ظہور قیامت میں ہوگا۔

2052- ﴿عَنْهَا﴾ میں اور بِهَا میں ضمیریں یا دونوں ساعت کی طرف جاتی ہیں یا دونوں صلوٰۃ کی طرف یا پہلی صلوٰۃ کی طرف اور دوسری ساعت کی طرف۔(ر) یعنی تجھے ساعت سے نہ روکے یا نماز سے نہ روکے۔وہ شخص جو ساعت پر ایمان نہیں لاتا یا وہ شخص جو نماز پر ایمان نہیں لاتا۔اور ہوسکتا ہے کہ ضمیر عَنْهَا میں فعل مفہوم کی طرف جاتی ہو یعنی تبلیغ امر حق سے نہ روکے۔اور اس پر دلیل یہ ہے کہ اس کے ساتھ ہی آیات دی ہیں جو تبلیغ سے روکنے والوں کے مقابلہ پر ہیں۔

2053- ﴿اَهُشُّ﴾۔هُشّ۔هزّ کے قریب قریب ہے۔یعنی اس کے معنی تحریک ہیں اور لاٹھی سے پتے جھاڑنے پر بولا جاتا ہے۔(غ) ﴿مَاٰرِبُ﴾۔مَأرَبة کی جمع ہے اور یہ اَرِبَ سے مصدر ہے اور اَرَب سخت حاجت کو کہتے ہیں جس کے لیے حیلہ کرنا پڑے۔(غ)

قَالَ اَلۡقِهَا يٰمُوۡسٰى ﴿۱۹﴾

کہا، اے موسیٰ! اسے ڈال دے۔

فَاَلۡقٰهَا فَاِذَا هِىَ حَيَّةٌ تَسۡعٰى ﴿۲۰﴾

سو اُسے ڈال دیا تو کیا دیکھا کہ وہ سانپ ہے (جو) دوڑ رہا ہے۔ (2054)

اور ﴿غَيۡرِ اُولِى الۡاِرۡبَةِ مِنَ الرِّجَالِ﴾ [النور: 31:24] ''مردوں میں سے ایسے جو (عورتوں کی) حاجت نہیں رکھتے۔'' میں اِربَۃ سے مراد نکاح کی حاجت ہے۔

وحی کی حالت میں بندے کی طرف سے سوال اور پھر بذریعہ وحی اس کا جواب بھی ہوسکتا ہے۔ یہاں وحی کے درمیان حضرت موسیٰ علیہ السلام کا جواب ایسا ہی ہے جیسے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو جب وحی ہوئی تو اسی حالت وحی میں آپ نے تین بار فرمایا [مَا أَنَا بِقَارِئٍ] (صحيح البخاری، كتاب بدء الوحی، باب 3، حديث: 3)۔

2054- **حضرت موسیٰؑ کے عصا کا ابتدائے نزول وحی میں باریک سانپ بننا اور فرعون کے سامنے اژدھا بننا اور اس کا مفہوم:** ﴿حَيَّةٌ﴾ سانپ کو کہتے ہیں اور یہ حیاۃ بمعنی زندگی سے مشتق ہے۔ بوجہ اپنی زندگی کے طول کے۔ (ل) اور چھوٹے بڑے دونوں پر اس کا استعمال ہوتا ہے۔ قرآن کریم میں تین جگہ یہ ذکر ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو وحی کی اور عصا ڈالنے کو کہا تو وہ سانپ بن گیا۔ ایک یہاں اور اسے حَيَّةٌ کہا ہے دوسرا [النمل: 10:27] میں اور تیسرا [القصص: 31:28] جہاں دونوں جگہ اسے جَانٌّ کہا ہے۔ اور جَانٌّ باریک سانپ کو کہتے ہیں اور دو جگہ یہ ذکر ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرعون کے سامنے عصا ڈالا تو وہاں دونوں جگہ ثُعۡبَانٌ کا لفظ ہے یعنی اژدھا [الأعراف: 107:7] اور [الشعرآء: 32:26] اور ساحروں کے مقابلہ پر جہاں ڈالنے کا حکم ہے تو وہاں ان دونوں میں سے کوئی لفظ اختیار نہیں فرمایا۔ صرف یہ فرمایا ہے کہ جو کچھ ساحروں نے بنایا تھا عصا اسے نگل گیا۔ [الأعراف: 117:7] [طٰهٰ: 69:20] [الشعرآء: 45:26] یہ فرق بلا وجہ نہیں ہوسکتا۔ ظاہر ہے کہ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اکیلے عصا کا سانپ بننا دکھایا گیا ہے تو یہ معجزہ نہیں۔ کیونکہ معجزہ کی ضرورت منکر کے لیے ہوتی ہے۔ اور حضرت موسیٰ علیہ السلام منکر نہ تھے۔ نہ یہ بتانے کو ہے کہ اس عصا میں یہ خاصیت ہے کہ جب ڈالا جائے گا تو سانپ بن جائے گا۔ کیونکہ نہ صرف اس کے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی ساری زندگی میں سوائے فرعون کے مقابلہ پر سانپ بننے کا ذکر نہیں کیا بلکہ خود ساحروں کے مقابل پر بھی حضرت موسیٰ علیہ السلام نے عصا نہیں ڈالا، جب تک کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے وحی نہیں ہوئی۔ پس ہر جگہ پر عصا ڈالنے اور اس کے سانپ بننے کی الگ غرض ہے۔ اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اپنے طور پر اس کیفیت کے دکھانے کا منشا یہ معلوم ہوتا ہے کہ آپ کی قوم کو اللہ تعالیٰ زندہ کرے گا۔ اور فرعون کے مقابل پر اژدھا بنانے کا یہ منشا ہے کہ آپ کی جماعت اسے اور اس کی افواج کو کھا جائے گی۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ عصا سانپ یا اژدھا نہیں بنا تھا۔ بلکہ یہ مطلب ہے کہ سانپ یا اژدھا بننے کے نیچے یہ مفہوم تھا۔

قَالَ خُذۡهَا وَ لَا تَخَفۡ ۫ سَنُعِيۡدُهَا سِيۡرَتَهَا الۡاُوۡلٰى ﴿۲۱﴾

کہا، اسے پکڑ لے اور ڈر نہیں، ہم اسے اس کی پہلی حالت پر لوٹا دیں گے۔ (2055)

وَ اضۡمُمۡ يَدَكَ اِلٰى جَنَاحِكَ تَخۡرُجۡ بَيۡضَآءَ مِنۡ غَيۡرِ سُوۡٓءٍ اٰيَةً اُخۡرٰى ﴿۲۲﴾ۙ

اور اپنا ہاتھ اپنے پہلو سے لگا، وہ سفید نکل آئے گا، بغیر اس کے کہ اس میں کوئی برائی ہو (یہ) دوسرا نشان (ہے)۔

لِنُرِيَكَ مِنۡ اٰيٰتِنَا الۡكُبۡرٰى ﴿۲۳﴾ۚ

تاکہ ہم تجھے اپنے بہت بڑے نشانوں میں سے دکھائیں۔ (2056)

ع 1 24 10 اِذۡهَبۡ اِلٰى فِرۡعَوۡنَ اِنَّهٗ طَغٰى ﴿۲۴﴾

فرعون کی طرف جا کہ وہ حد سے نکل گیا ہے۔

قَالَ رَبِّ اشۡرَحۡ لِىۡ صَدۡرِىۡ ﴿۲۵﴾ۙ

(موسیٰ نے) کہا، میرے رب میرا سینہ کھول دے۔

وَ يَسِّرۡ لِىۡۤ اَمۡرِىۡ ﴿۲۶﴾ۙ

اور میرا کام میرے لیے آسان کر دے۔

وَ احۡلُلۡ عُقۡدَةً مِّنۡ لِّسَانِىۡ ﴿۲۷﴾ۙ

اور میری زبان کی گرہ کھول دے۔

يَفۡقَهُوۡا قَوۡلِىۡ ﴿۲۸﴾ۖ

تاکہ میری بات کو سمجھ لیں۔ (2057)

2055- سِیۡرَت- سِیۡرَ چلنے کا نام ہے اور سِیۡرَتۡ وہ حالت ہے جس پر انسان ہو۔ قدرتی ہو یا اکتساب سے حاصل ہوئی ہو۔ جیسے کہا جاتا ہے اس کی سیرت اچھی ہے، اس کی سیرت بری ہے۔ اور یہاں مراد ہے اس کی پہلی یعنی لکڑی ہونے کی حالت۔ (غ)
اس سے معلوم ہوا کہ عصا کے سانپ ہونے کی حالت محض ایک وقتی حالت تھی۔

2056- ﴿لِنُرِيَكَ مِنۡ اٰيٰتِنَا الۡكُبۡرٰى ﴿۲۳﴾ۚ﴾ کے معنی یوں بھی کر لیے گئے ہیں کہ یہی بڑی نشانیاں ہیں جو ہم تمہیں دکھانا چاہتے ہیں۔ مگر میرے نزدیک مطلب یہ ہے کہ یہ نشان جو ہم نے دکھائے ہیں اس لیے دکھائے ہیں تاکہ اس سے بھی بڑے نشان تمہیں دکھائیں اور اس سے بڑے نشانوں سے مراد وہی غلبہ ہے جس کی طرف ان نشانات میں اشارہ تھا۔

2057- شرح صدر کے لیے [دیکھو نمبر: 1014] مراد دلائل کا ملنا ہے اور یسر میں مشکلات کے دور ہونے کی دعا ہے اور عقدہ لسان کے کھلنے سے مراد جیسا کہ امام راغب نے لکھا ہے قوت بیانی میں جو نقص ہے اس کا دور کیا جانا [دیکھو نمبر: 2008] اور قرآن شریف

وَ اجۡعَلۡ لِّیۡ وَزِیۡرًا مِّنۡ اَهۡلِیۡ ﴿۲۹﴾ اور میرے ساتھیوں میں سے ایک میرا بوجھ بٹانے والا بنادے۔

هٰرُوۡنَ اَخِی ﴿۳۰﴾ ہارون میرا بھائی۔(2058)

نے خود بھی یہی فرمایا ہے۔ کیونکہ ایک جگہ فرعون کا اعتراض ہے ﴿وَّ لَا یَكَادُ یُبِیۡنُ﴾[الزخرف: 52:43] یعنی موسیٰ میں قوت بیانی نہیں۔ اور حضرت موسیٰ علیہ السلام خود ہارون علیہ السلام کا ذکر کرکے فرماتے ہیں ﴿هُوَ اَفۡصَحُ مِنِّیۡ لِسَانًا﴾[القصص: 34:28] ''وہ مجھ سے فصیح زبان والا ہے۔'' اور خود اپنے متعلق فرماتے ہیں ﴿وَ یَضِیۡقُ صَدۡرِیۡ وَ لَا یَنۡطَلِقُ لِسَانِیۡ﴾[الشعرآء: 13:26] ''اور میرا سینہ رکتا ہے اور میری زبان نہیں چلتی۔'' پس یہ خیال کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی زبان (جَارِحَۃ) میں کوئی گرہ تھی، صحیح نہیں۔ اور یہاں عَصَا اور یَدِ بَیۡضَا کا نشان مل جانے کے بعد حضرت موسیٰ علیہ السلام تین باتوں کے لیے دعا کرتے ہیں۔ اوّل شرح صدر یعنی اعلیٰ درجہ کی دلائل میسر آ جائیں۔ دوسرے ان دلائل کے پیش کرنے میں جو مشکلات اور رکاوٹیں ہیں وہ دور ہو جائیں۔ تیسرے فصاحت لسانی ملے اور ان سب کا نتیجہ یہ کہ آپ کے مخاطب اصل بات کو اچھی طرح سمجھ لیں۔ جس سے صاف معلوم ہوا کہ تبلیغ حق کے لیے ان باتوں کی ضرورت حضرت موسیٰ علیہ السلام کو تھی۔ جیسے آج ہر مبلغ کو ہے۔

2058- ﴿وَزِیۡرًا﴾۔ بمعنی مُوازِر ہے اور بادشاہ کے وزیر کو وزیر اس لیے بولا جاتا ہے کہ تدبیر مملکت کا بوجھ بادشاہ پر ہے وہ اسے اٹھاتا ہے۔ (ل) اور مَوَازِرَۃٌ بمعنی معاونت ہے۔ (غ)

حضرت موسیٰؑ کی درخواست ہارونؑ کو نبی بنانے کی نہیں اپنا معاون بنانے کی ہے:

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی یہ دوسری درخواست جناب باری میں ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ بنی اسرائیل کو فرعون کے قبضہ سے نکالنے کے لیے اور اس کی سارے پہلوؤں میں اصلاح کے لیے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنے آپ کو کافی نہیں سمجھا اور ایک مددگار ساتھ چاہا ہے۔ اور اس مددگار کو نام سے مخصوص کیا ہے۔ مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے دعا کی تھی کہ ہارون علیہ السلام کو نبی بنادیا جائے۔ ایسی کسی دعا کا قرآن شریف میں کوئی ذکر نہیں۔ اور ﴿فَاَرۡسِلۡ اِلٰی هٰرُوۡنَ﴾[الشعرآء: 13:26] ''تو ہارون کی طرف (میری مدد کے لیے) پیغام بھیج۔'' ﴿فَاَرۡسِلۡهُ مَعِیَ﴾[القصص: 34:28] ''سو اسے میرے ساتھ بھیج۔'' سے بھی یہ مراد نہیں کہ اسے رسول بنادے۔ بلکہ اپنے ساتھ فرعون کی طرف بھیجا جانے کی درخواست ہے اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کی اس دعا سے معلوم ہوتا ہے کہ انہیں یہ علم تھا کہ ان کے بھائی ہارون علیہ السلام کو نبوت مل چکی ہے (اور یہ حضرت موسیٰ علیہ السلام سے بڑے تھے۔) پس ان کی درخواست یہ ہے کہ کام مشترک طور پر دونوں کے سپرد ہوتا کہ ایک دوسرے کی قوت کا موجب ہوں۔ جیسا کہ ﴿اشۡدُدۡ بِهٖۤ اَزۡرِیۡ ﴿۳۲﴾ وَ اَشۡرِكۡهُ فِیۡۤ اَمۡرِیۡ ﴿۳۳﴾﴾ سے ظاہر ہے۔ سلسلہ کی ابتدا اور انتہا کو چونکہ زیادہ وقعت حاصل ہوتی ہے اس لیے سلسلہ اسرائیلی کی ابتدا میں بھی دو نبی پائے جاتے ہیں یعنی موسیٰ اور ہارون علیہم السلام اور انتہا میں بھی دو ہیں یعنی عیسیٰ اور یحییٰ علیہم السلام۔

اشۡدُدۡ بِهٖۤ اَزۡرِیۡ ۳۱ — میری قوت کو اس کے ساتھ مضبوط کر۔ (2059)

وَ اَشۡرِكۡهُ فِیۡۤ اَمۡرِیۡ ۳۲ — اور میرے کام میں اسے شریک کر۔ (2060)

كَیۡ نُسَبِّحَكَ كَثِیۡرًا ۳۳ — تاکہ ہم تیری بہت تسبیح کریں۔

وَّ نَذۡكُرَكَ كَثِیۡرًا ۳۴ — اور تجھے بہت یاد کریں۔

اِنَّكَ كُنۡتَ بِنَا بَصِیۡرًا ۳۵ — تو ہمیں ہر حال میں دیکھتا ہے۔

قَالَ قَدۡ اُوۡتِیۡتَ سُؤۡلَكَ یٰمُوۡسٰی ۳۶ — کہا، اے موسیٰ! تیری درخواست منظور ہوئی۔ (2061)

وَ لَقَدۡ مَنَنَّا عَلَیۡكَ مَرَّةً اُخۡرٰۤی ۳۷ — اور یقیناً ہم نے تجھ پر ایک بار اور احسان کیا۔

اِذۡ اَوۡحَیۡنَاۤ اِلٰۤی اُمِّكَ مَا یُوۡحٰۤی ۳۸ — جب ہم نے تیری ماں کی طرف وحی کی جو (اب) وحی کی جاتی ہے۔

اَنِ اقۡذِفِیۡهِ فِی التَّابُوۡتِ فَاقۡذِفِیۡهِ فِی الۡیَمِّ
فَلۡیُلۡقِهِ الۡیَمُّ بِالسَّاحِلِ یَاۡخُذۡهُ عَدُوٌّ لِّیۡ
وَ عَدُوٌّ لَّهٗ ؕ وَ اَلۡقَیۡتُ عَلَیۡكَ مَحَبَّةً
مِّنِّیۡ ۚ۬ وَ لِتُصۡنَعَ عَلٰی عَیۡنِیۡ ۳۹ وقف لازم

کہ اسے صندوق میں ڈال دے، پھر اس (صندوق) کو دریا میں ڈال دے تو دریا اسے کنارے پر ڈال دے گا۔ تاکہ میرا ایک دشمن اور اس کا دشمن اسے لے لے اور میں نے تجھ پر اپنی طرف سے محبت ڈالی۔ اور تاکہ میرے سامنے تیری تربیت کی جائے۔ (2062)

2059- اَزۡرِ۔ اس کی اصل اِزار سے ہے جو لباس ہے۔ اور آزاد قوت شدید کو کہتے ہیں۔ اور اٰزَرَہٗ اسے مدد دی اور مضبوط کیا ﴿اَخۡرَجَ شَطۡـَٔهٗ فَاٰزَرَهٗ﴾ [الفتح: 29:48] ''جس نے اپنی سوئی نکالی پھر اسے مضبوط کیا۔''

2060- اَمۡرِ سے مراد یہاں امر تبلیغ و دعوت الی الحق ہے نہ نبوت۔

2061- سُؤۡلَ۔ فُعل بمعنی مفعول ہیں یعنی مسئول۔ اور سوال کے لیے [دیکھو نمبر: 215]۔

2062- اقۡذِفِیۡ۔ قَذَفَ کے معنی دور پھینکنا ہیں اور یہاں معنی طرح یعنی ڈال دینا ہیں ﴿وَ قَذَفَ فِیۡ قُلُوۡبِهِمُ الرُّعۡبَ﴾ [الأحزاب: 26:33]

اِذۡ تَمۡشِیۡۤ اُخۡتُكَ فَتَقُوۡلُ هَلۡ اَدُلُّكُمۡ عَلٰی مَنۡ یَّكۡفُلُهٗ ؕ فَرَجَعۡنٰكَ اِلٰۤی اُمِّكَ كَیۡ تَقَرَّ عَیۡنُهَا وَ لَا تَحۡزَنَ ؕ وَ قَتَلۡتَ نَفۡسًا فَنَجَّیۡنٰكَ مِنَ الۡغَمِّ وَ فَتَنّٰكَ فُتُوۡنًا ۬ؕ فَلَبِثۡتَ سِنِیۡنَ فِیۡۤ اَهۡلِ مَدۡیَنَ ۙ

جب تیری بہن گئی اور کہا کیا میں تمہیں بتاؤں جو (اس کی پرورش) کو اپنے ذمہ لے، سو ہم نے تجھے تیری ماں کی طرف لوٹایا تا کہ اس کی آنکھ ٹھنڈی رہے اور وہ غم نہ کرے اور تو نے ایک شخص کو مار ڈالا، سو ہم نے تجھے غم سے نجات دی اور ہم نے تجھے طرح طرح کی تکلیفوں میں مبتلا کیا، پھر تو مدین کے لوگوں میں کئی سال رہا،

''اور ان کے دلوں میں رعب ڈال دیا۔'' ﴿بَلۡ نَقۡذِفُ بِالۡحَقِّ عَلَی الۡبَاطِلِ﴾ [الأنبیآء: 18:21] ''بلکہ ہم حق کو باطل پر ڈالتے ہیں۔'' ﴿وَ یُقۡذَفُوۡنَ مِنۡ كُلِّ جَانِبٍ﴾ [الصفات: 8:37] ''اور ہر طرف سے ملامت کیے جاتے ہیں۔'' اور استعارۃً شتم اور عیب بھی اس کے معنی آتے ہیں۔ (غ)

الۡیَمِّ۔ یَمّ کے معنی دریا یا سمندر ہیں اور اس کے معنی قصد کرنا بھی آتے ہیں جس سے تیمم ہے۔ (غ)

تُصۡنَعَ۔ صُنۡعَ کے معنی ہیں [اِجَادَةِ الۡفِعۡل] یعنی کام کا اچھا بنانا۔ اور اِصۡطِنَاعٌ کسی چیز کی اصلاح میں کمال کر دینا ہے اور ﴿وَ اصۡطَنَعۡتُكَ لِنَفۡسِیۡ﴾ اور ﴿وَ لِتُصۡنَعَ عَلٰی عَیۡنِیۡ﴾ میں اشارہ اسباب کی طرف ہے۔ جیسا کہ بعض حکما نے کہا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کسی بندہ سے محبت کرتا ہے تو اس کے لیے تعاہد کرتا ہے۔ جس طرح دوست دوست سے تعاہد کرتا ہے۔ (غ) اور [صَنَع الۡفَرَسِ] سے مراد ہے گھوڑے کی نگہداشت نہایت خوبی سے کی اور [صَنَعَ جَارِیَةٌ] کے معنی ہیں لونڈی کی تربیت کی اور ﴿لِتُصۡنَعَ عَلٰی عَیۡنِیۡ﴾ کے معنی ہیں تا کہ میرے سامنے تیری تربیت کی جائے۔ (ل) اور صَنَعَ کے معنی احسان بھی کیے گئے ہیں۔ یعنی مراد یہ ہے کہ تا تیری پرورش مہربانی اور شفقت سے ہو۔ (ر) ﴿عَلٰی عَیۡنِیۡ﴾ سے مراد ہے میرے سامنے گویا میں دیکھ رہا ہوں اور کوئی امر میرے خلاف منشا تم میں نہیں ہو سکتا۔

یہاں اللہ تعالیٰ نے اس وحی کا ذکر کیا ہے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کو ہوئی کہ اپنے بچہ کو صندوق میں رکھ کر دریا میں ڈال دے۔ اللہ تعالیٰ خود اس کی حفاظت کے سامان پیدا کر دے گا، اور ایسا ہی انہوں نے کیا۔ اس سے معلوم ہوا کہ وحی الٰہی غیر نبی کو بھی (کیونکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی والدہ نبیہ نہ تھیں) ایسی ہی یقینی ہو سکتی ہے جیسے نبی کو۔ لیکن ہمیں جو امور ظاہر کیے جاتے ہیں وہ اور رنگ کے ہوتے ہیں۔ اگر حضرت موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کو اس وحی کے منجانب اللہ ہونے کا یقین کامل نہ ہوتا تو وہ اپنے بچہ کو اس کی بنا پر دریا میں نہ ڈال سکتی تھیں۔ فرعون کو یہاں اللہ تعالیٰ کا سب سے بڑا دشمن کہا ہے، اس لیے کہ وہ حق کا دشمن تھا۔ اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کا بھی دشمن کہا ہے۔ یا تو اس لحاظ سے کہ وہ آگے چل کر دشمن ثابت ہوا اور یا اس لیے کہ وہ بنی اسرائیل کے سب بچوں کا دشمن تھا۔

ثُمَّ جِئْتَ عَلٰى قَدَرٍ يّٰمُوْسٰى ۝٤٠	پھر تو اے موسیٰ ایک اندازے پر آ گیا۔(2063)
وَ اصْطَنَعْتُكَ لِنَفْسِيْ ۝٤١	اور میں نے تجھے اپنے لیے کمال خوبی میں بنایا۔(2064)
اِذْهَبْ اَنْتَ وَ اَخُوْكَ بِاٰيٰتِيْ وَ لَا تَنِيَا فِيْ ذِكْرِيْ ۝٤٢	تو اور تیرا بھائی میری آیتوں کے ساتھ جاؤ اور میرے ذکر میں سستی نہ کرنا۔(2065)

اللہ تعالیٰ کی طرف سے حضرت موسیٰ علیہ السلام پر محبت ڈالنے میں یہ بتایا ہے کہ انبیاء علیہم السلام کی محبت قلوب میں پہلے سے ہوتی ہے۔ یہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی خصوصیت نہیں۔ بلکہ اس قسم کے الفاظ سب ہی انبیاء پر صادق آتے ہیں۔ خود ہمارے نبی کریم ﷺ پر اسی طرح اللہ تعالیٰ کی طرف سے محبت ڈالی گئی تھی اور کوئی دل نہ تھا جو آپ کی محبت سے خالی ہوتا۔ اور اللہ تعالیٰ کا فرمانا کہ میرے سامنے تو اچھا بنایا جائے، ظاہر کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ انبیاء کے لیے پرورش کے سامان بھی ایسے مہیا فرما دیتا ہے کہ ان کی تربیت اچھی ہو۔ اور اللہ تعالیٰ کے سامنے اس لیے کہا کہ اللہ تعالیٰ ان میں کوئی ایسی بات پیدا ہونے نہیں دیتا جو ان کے آئندہ منصب کے خلاف ہو۔ وہ گویا اللہ تعالیٰ کے حضور پرورش پاتے ہیں، گو ظاہری ذرائع کیسے ہی ہوں۔ یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ دشمنوں کے ہاتھ سے بھی ان کی پرورش اسی اعلیٰ درجہ معیار پر کرا لیتا ہے۔ یہ بھی انبیاء کی عصمت پر دلیل ہے۔

2063- ﴿فُتُوْنًا﴾ یا مصدر ہے (فعول کے وزن پر) یا فِتَنٌ کی جمع ہے یعنی طرح طرح کے ابتلا یا فِتْنَةٌ کی جمع ہے، یعنی طرح طرح کی تکالیف میں ڈالا۔ اور راغب کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے فِتَنٌ یا دکھوں میں ڈالنا حکمت کے طریق پر ہوتا ہے جس طرح سونے کو آگ میں ڈالا جاتا ہے اور یہاں یہی مراد ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو طرح طرح کی تکالیف میں ڈالا تا کہ آپ اس منصب پر کھڑا ہونے کے اہل ہو جائیں، جس پر آپ کا کھڑا ہونا مقدر تھا۔ اور کوئی نبی نہیں جسے تکالیف میں نہ ڈالا گیا ہو۔

﴿عَلٰى قَدَرٍ﴾۔ قَدَرٌ قضائے موفق کو کہا جاتا ہے جب ایک چیز دوسری کے موافق ہو۔ (ل) پس ﴿عَلٰى قَدَرٍ﴾ سے مراد ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا آنا یعنی سفر مصر اختیار کرنا اس اندازہ پر تھا کہ وہی وقت آپ پر نزول وحی کا بھی آ پہنچا تھا اور بعض نے قَدَرٌ کو بمعنی قَدْرٌ لے کر مقدار معنی لیے ہیں۔ یعنی اس زمانہ کو پہنچ گیا جس میں انبیاء پر وحی نازل ہوتی ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کو واپس ماں کے پاس پہنچا دینے کا ذکر اس لیے کیا تا معلوم ہو کہ وحی الٰہی اس راستہ پر کبھی نہیں ڈالتی جس کا نتیجہ ہلاکت ہو۔ بلکہ بظاہر ہلاکت کے سامان بھی معلوم ہوتے ہیں تو انجام اچھا ہوتا ہے۔

2064- اَصْطِنَاعٌ کے لیے [دیکھو نمبر: 2062] لِنَفْسِيْ اپنی ذات کے لیے۔ اس لیے کہ انبیاء اللہ تعالیٰ کا نام ہی دنیا میں پھیلاتے ہیں اور نیکی اور پاکیزگی کی تعلیم دیتے ہیں۔ چنانچہ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے اس کے معنی مروی ہیں اپنی وحی اور رسالت کے لیے۔ (ر) پس معلوم ہوا کہ انبیاء کی زندگی محض خدا کے لیے ہوتی ہے۔ اور وہ تمام اغراض نفسانی سے پاک ہوتے ہیں۔

2065- تَنِيَا، وَنٰی سے ہے جس کے معنی ضعف، فتور، عاجز آ جانا، تھک جانا ہیں۔ (ل)

اِذۡهَبَاۤ اِلٰى فِرۡعَوۡنَ اِنَّهٗ طَغٰى ﴿۴۳﴾

دونوں فرعون کی طرف جاؤ کہ وہ حد سے نکل گیا ہے۔

فَقُوۡلَا لَهٗ قَوۡلًا لَّيِّنًا لَّعَلَّهٗ يَتَذَكَّرُ اَوۡ يَخۡشٰى ﴿۴۴﴾

سو اسے نرم بات کہو، شاید وہ نصیحت پکڑے یا ڈرے۔ (2066)

قَالَا رَبَّنَاۤ اِنَّنَا نَخَافُ اَنۡ يَّفۡرُطَ عَلَيۡنَاۤ اَوۡ اَنۡ يَّطۡغٰى ﴿۴۵﴾

دونوں نے کہا، ہمارے رب ہم ڈرتے ہیں کہ وہ ہم پر زیادتی کرے یا حد سے نکل جائے۔ (2067)

قَالَ لَا تَخَافَاۤ اِنَّنِىۡ مَعَكُمَاۤ اَسۡمَعُ وَ اَرٰى ﴿۴۶﴾

کہا، مت ڈرو میں تمہارے ساتھ ہوں، سنتا ہوں اور دیکھتا ہوں۔

حالانکہ اوپر ذکر صرف حضرت موسیٰ علیہ السلام کا تھا مگر یہاں دونوں کو خطاب ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ درمیانی واقعات بہت سے چھوڑ دیئے ہیں۔ یا حضرت ہارون علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے بذریعہ وحی مطلع فرمایا۔

2066- **دعوت الی الحق کا صحیح طریق:** لَيِّنٌ۔ لِيْنٌ سے ہے [دیکھو نمبر: 551] نرم بات۔ خود اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ فرعون حد سے گزر گیا ہے۔ وہ بنی اسرائیل کے لڑکوں کو قتل کرتا تھا اور نہایت ذلیل کام ان سے لیتا تھا۔ بایں کلمہ حق پہنچانے کے لیے اپنے نبیوں کو بھی ارشاد ہوتا ہے کہ اس سے نرمی سے بات کرنا اور پھر ساتھ ہی امید دلاتا ہے کہ شاید وہ نصیحت پکڑے۔ یہ ہے تبلیغ حق کا طریق، جس کی پیروی آج مسلمانوں کو کرنی چاہئے۔ اگر وہ اس وقت اسی حالت میں ہی جس میں بنی اسرائیل فرعون کے ماتحت تھے، اگر ان پر حکمران قوم حد سے نکل چکی ہے، اگر ان کے بیٹے ذبح کیے جاتے ہیں، اگر ان کو ذلیل سمجھا جاتا ہے اور ذلیل حالت میں رکھا جاتا ہے تو بھی اس قوم سے مایوس نہ ہونا چاہئے۔ ﴿لَّعَلَّهٗ يَتَذَكَّرُ اَوۡ يَخۡشٰى﴾ جب ایک شقی ازلی کے متعلق بھی ہے تو آج کیوں قَوۡلٍ لَّيِّنٌ سے دعوت الی الحق دے کر ان کے مسلمان ہونے کی امید نہ رکھی جائے۔ فرعون کا تذکرہ مسلمانوں کی ہدایت کے لیے ہے مگر وہ فائدہ نہیں اٹھاتے۔

2067- ﴿يَّفۡرُطَ﴾۔ فَرَطٌ کے معنی ہیں تَقَدَّمَ یعنی پیش دستی کی اور فَرَطَ عَلَيۡهِ کے معنی ہیں [اَسۡرَفَ وَ تَقَدَّمَ] یعنی زیادتی کی اور پیش دستی کی۔ (ل)

اور یہاں مراد ہے کہ قبل اس کے کہ ہمارے پیغام کو سنے، ہمارے اوپر کوئی حکم سزا صادر کرے۔ اور يَّطۡغٰى سے مراد ہے کہ اللہ تعالیٰ کی شان میں طغیان کرے۔

فَاۡتِيٰهُ فَقُوۡلَاۤ اِنَّا رَسُوۡلَا رَبِّكَ فَاَرۡسِلۡ مَعَنَا بَنِىۡۤ اِسۡرَآءِيۡلَ‌ۙ وَ لَا تُعَذِّبۡهُمۡ‌ؕ قَدۡ جِئۡنٰكَ بِاٰيَةٍ مِّنۡ رَّبِّكَ‌ؕ وَ السَّلٰمُ عَلٰى مَنِ اتَّبَعَ الۡهُدٰى ﴿۴۷﴾

سو اُس کے پاس جاؤ اور کہو ہم تیرے رب کے دو رسول ہیں سو بنی اسرائیل کو ہمارے ساتھ بھیج دے اور انہیں دکھ نہ دے ہم تیرے رب کی طرف سے تیرے پاس ایک نشان لائے ہیں اور اس پر سلامتی ہے جو ہدایت کی پیروی کرتا ہے۔ (2068)

اِنَّا قَدۡ اُوۡحِىَ اِلَيۡنَاۤ اَنَّ الۡعَذَابَ عَلٰى مَنۡ كَذَّبَ وَ تَوَلّٰى ﴿۴۸﴾

ہماری طرف یہ وحی ہوئی ہے کہ عذاب اُس پر ہے، جو جھٹلاتا ہے اور پھر جاتا ہے۔

قَالَ فَمَنۡ رَّبُّكُمَا يٰمُوۡسٰى ﴿۴۹﴾

(فرعون نے) کہا، اے موسیٰ! تم دونوں کا رب کون ہے؟ (2069)

قَالَ رَبُّنَا الَّذِىۡۤ اَعۡطٰى كُلَّ شَىۡءٍ خَلۡقَهٗ ثُمَّ هَدٰى ﴿۵۰﴾

کہا، ہمارا رب وہ ہے جس نے ہر چیز کو اس کی پیدائش عطا کی پھر اسے (اپنے کمال کی) راہ دکھائی۔ (2070)

قَالَ فَمَا بَالُ الۡقُرُوۡنِ الۡاُوۡلٰى ﴿۵۱﴾

اس نے کہا تو پھر پہلی نسلوں کا کیا حال ہے۔

2068- یہاں جو یہ فرمایا کہ ہم ایک آیت تیرے پاس لائے ہیں تو ظاہر ہے کہ اس سے مراد رسالت یا پیغام ہی ہے دیکھو آیت کے معنی کے لیے [نمبر:60]۔ کیونکہ اگر اس سے مراد معجزہ ہوتا تو معجزے دو تھے ایک نہ تھا۔ اور یہی وجہ ہے کہ ساتھ ہی فرمایا ﴿مَنِ اتَّبَعَ الۡهُدٰى﴾ گویا وہ آیت ہدایت الٰہی یا پیغام الٰہی ہی ہے نہ کچھ اور۔

2069- یہاں پھر بہت سے درمیانی واقعات کو چھوڑ دیا ہے۔ یہاں تک کہ حضرت موسیٰ اور ہارون علیہما السلام دونوں فرعون کے پاس پہنچ کر اپنا پیغام ادا کرتے ہیں۔

2070- سوال ربّ کے متعلق تھا۔ اس لیے فرمایا کہ وہ صرف خالق ہی نہیں اور اس نے مخلوق کو پیدا کر کے یونہی نہیں چھوڑ دیا بلکہ اس کی ربوبیت کا یہ اقتضا ہے کہ اسے ہدایت بھی دی۔ یعنی منزل مقصود تک پہنچنے کی راہ دکھائی۔ ایسی فطری ہدایت سے ہر چیز اپنے دائرہ میں کمال کو حاصل کرتی ہے اور اس میں وحی الٰہی کی ضرورت پر بھی دلیل ہے اور بتایا ہے کہ انسان کو اس کے کمال تک پہنچنے کے لیے وحی کی ضرورت ہے۔ کیونکہ روحانی کمال کے لیے روحانی سامانوں کی ہی ضرورت ہے۔

قَالَ عِلۡمُهَا عِنۡدَ رَبِّىۡ فِىۡ كِتٰبٍ‌ۚ لَا يَضِلُّ رَبِّىۡ وَلَا يَنۡسَى ۝۵۲

کہا، ان کا علم میرے رب کے پاس کتاب میں ہے، میرا رب غلطی نہیں کرتا، نہ بھولتا ہے۔ (2071)

الَّذِىۡ جَعَلَ لَـكُمُ الۡاَرۡضَ مَهۡدًا وَّسَلَكَ لَـكُمۡ فِيۡهَا سُبُلًا وَّاَنۡزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً‌ؕ فَاَخۡرَجۡنَا بِهٖۤ اَزۡوَاجًا مِّنۡ نَّبَاتٍ شَتّٰى ۝۵۳

وہ جس نے تمہارے لیے زمین کو فرش بنایا اور تمہارے لیے اس میں رستے چلائے اور بادل سے پانی اتارا، پھر ہم اس کے ساتھ مختلف سبزیوں کے جوڑے پیدا کرتے ہیں۔ (2072)

كُلُوۡا وَارۡعَوۡا اَنۡعَامَكُمۡ‌ؕ اِنَّ فِىۡ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّاُولِى النُّهٰى ۝۵۴ ع 2 30 11

کھاؤ اور اپنے چارپایوں کو چراؤ یقیناً اس میں عقل والوں کے لیے نشان ہیں۔ (2073)

مِنۡهَا خَلَقۡنٰكُمۡ وَفِيۡهَا نُعِيۡدُكُمۡ وَمِنۡهَا نُخۡرِجُكُمۡ تَارَةً اُخۡرٰى ۝۵۵

اسی (زمین) سے ہم نے تمہیں پیدا کیا اور اسی میں تمہیں لوٹائیں گے اور اسی سے ہم تمہیں دوسری دفعہ نکالیں گے۔ (2074)

2071- سوال کا مطلب یہ تھا کہ پہلی قومیں جنہیں یہ ہدایت نہیں ملی ان کا کیا حال ہے؟ تو اس کا جواب دیا ہے کہ وہ میرا کام نہیں، اللہ تعالیٰ نے ان کے مناسب حال جو سامان چاہا کر دیا۔ کیونکہ ہر چیز اللہ تعالیٰ کے علم میں ہے۔ وہ نہ کسی کے متعلق غلطی کرتا ہے نہ کسی کو بھولتا ہے۔ ﴿لَا يَنۡسَى﴾ میں یہ اشارہ بھی ہوسکتا ہے کہ وہ کتاب کا محتاج نہیں، جس طرح انسان بوجہ نسیان کے محتاج ہوتا ہے۔ گویا اس کی کتاب بھی اس کا علم ہے جس سے کوئی چیز باہر نہیں۔

2072- اس میں اسی پہلی دلیل کو اور بسط کے ساتھ بیان کیا ہے اور بتایا ہے کہ جس طرح اوپر سے پانی برستا ہے تو زمین کی روئیدگیاں نکل آتی ہیں۔ اسی طرح وحی الٰہی قلب انسانی کو زندگی بخشتی ہے اور اس میں طرح طرح کی قوتیں نشوونما پاتی ہیں۔ اَزۡوَاج کے لفظ میں یہی اشارہ ہے کہ ہر ایک چیز اپنا ایک زوج رکھتی ہے، جس سے اثر قبول کر کے وہ بقائے حیات میں معاون ہوتی ہے۔ قلب انسانی بغیر ہدایت وحی کے ترقی نہیں کر سکتا۔

2073- النُّهٰى۔ نُهیۃ کی جمع ہے جس کے معنی عقل ہیں۔ اس لیے کہ وہ بری باتوں سے روکتی ہے۔ نَهٰى کے لیے [دیکھو نمبر: 952]۔

2074- ﴿تَارَةً﴾۔ تَوۡرَ سے ہے (اور تَوۡرَ ایک برتن ہے) اور اس کے معنی مَرَّةً یا دفعہ ہیں۔ اور ﴿تَارَةً اُخۡرٰى﴾ کے معنی کیے ہیں [مَرَّةً بَعۡدَ مَرَّةٍ]۔ (ل)

وَ لَقَدْ اَرَيْنٰهُ اٰيٰتِنَا كُلَّهَا فَكَذَّبَ وَ اَبٰى ﴿۵۶﴾

اور ہم نے اسے اپنے سب کے سب نشان دکھائے مگر اس نے جھٹلایا اور انکار کیا۔ (2075)

قَالَ اَجِئْتَنَا لِتُخْرِجَنَا مِنْ اَرْضِنَا بِسِحْرِكَ يٰمُوْسٰى ﴿۵۷﴾

کہا، اے موسیٰ! کیا تو ہمارے پاس آیا ہے کہ اپنے جادو سے ہمیں اپنے ملک سے نکال دے۔

فَلَنَاْتِيَنَّكَ بِسِحْرٍ مِّثْلِهٖ فَاجْعَلْ بَيْنَنَا وَ بَيْنَكَ مَوْعِدًا لَّا نُخْلِفُهٗ نَحْنُ وَ لَاۤ اَنْتَ مَكَانًا سُوًى ﴿۵۸﴾

سو ہم بھی ضرور تیرے پاس اسی طرح کا جادو لائیں گے۔ سو ہمارے اور اپنے درمیان ایک وعدہ ٹھہرالے جس کی نہ ہم خلاف ورزی کریں اور نہ تو، برابر مکان میں (ہوں)۔ (2076)

انسان کی پہلی اور دوسری پیدائش کا اسی زمین میں ہونا:

سب انسان زمین سے ہی پیدا ہوتے ہیں اور زمین میں ہی لوٹ کر جاتے ہیں، یہ تو ظاہر ہے۔ اور دوسری مرتبہ زمین سے پیدا کیا جانا اس لحاظ سے ہے کہ انسان کے وہ اعمال جن سے اس کی دوسری زندگی پیدا ہوتی ہے اسی زمین پر ہی ہوتے ہیں نہ اس سے باہر۔ اور سچ تو یہ ہے کہ پہلی مرتبہ پیدا کیا جانا بھی کئی مراحل سے وقوع میں آتا ہے اور یہ نہیں ہوتا کہ ایک مٹی کا بت بنا کر کھڑا کر دیا جائے۔ بلکہ اس مٹی سے نباتات و غلے پیدا ہوتے ہیں جنہیں حیوانات کھاتے ہیں اور انسان بھی۔ پھر ان غذاؤں کا خلاصہ در خلاصہ وہ چیز ہے جس سے ہر انسان کی پیدائش کی ابتدا ہوتی ہے۔ دوسری زندگی کن مراحل سے گزر کر آئے گی اور کن طریقوں پر یا کیسی ہوگی؟ یہ کوئی نہیں کہہ سکتا۔ کیونکہ یہ دوسرے عالم کے متعلق ہے۔

2075- نشان تو صرف دو ہی تھے یعنی عَصَا اور يَدِ بَيْضَا۔ کیونکہ باقی نشان اس واقعہ کے بہت بعد دکھائے گئے۔ پس یہاں نشانوں یا آیات میں علاوہ معجزات کے دلائل و بینات بھی داخل ہیں جو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بیان کیے۔ جیسا کہ اوپر انہی آیات کا ذکر ہے۔ یعنی جو دلائل حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دلائل کا جو ہستی باری اور ضرورت وحی پر دیئے ہیں۔ اور فرعون کے سامنے عصا ڈالنے یا سفید ہاتھ نکالنے کا یہاں مطلق ذکر نہیں۔ اور انہی دلائل کو یہاں آیات کہا ہے اور اسی کا نام فرعون نے سحر رکھا ہے۔ جیسا کہ اگلی آیت میں ﴿لِتُخْرِجَنَا مِنْ اَرْضِنَا بِسِحْرِكَ﴾ گویا یہ دلائل بھی سحر ہیں اور دلائل اور بیان کا سحر ہونا [اِنَّ مِنَ الْبَيَانِ لَسِحْرًا] (صحيح البخاری، كتاب الطب، باب مِنَ الْبَيَانِ سِحْرًا، حديث: 5767) سے ظاہر ہے۔ [دیکھو نمبر: 129]۔

2076- **فرعون کا تحقیق مذہبی میں برابری اختیار کرنا:** ﴿مَكَانًا سُوًى﴾ کے ایک معنی کیے گئے ہیں کہ ہم سے اور تم سے برابر مسافت

قَالَ مَوۡعِدُكُمۡ يَوۡمُ الزِّيۡنَةِ وَ اَنۡ يُّحۡشَرَ النَّاسُ ضُحًى ﴿۵۹﴾

کہا، تمہارا وعدے کا وقت جشن کا دن ہے اور یہ کہ لوگ چاشت کے وقت جمع کیے جائیں۔ (2077)

فَتَوَلّٰى فِرۡعَوۡنُ فَجَمَعَ كَيۡدَهٗ ثُمَّ اَتٰى ﴿۶۰﴾

سو فرعون پھر گیا اور اپنی تدبیروں کو جمع کیا پھر آیا۔ (2078)

قَالَ لَهُمۡ مُّوۡسٰى وَيۡلَكُمۡ لَا تَفۡتَرُوۡا عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا فَيُسۡحِتَكُمۡ بِعَذَابٍ ۚ وَ قَدۡ خَابَ مَنِ افۡتَرٰى ﴿۶۱﴾

موسیٰ نے انہیں کہا، تم پر افسوس! اللہ پر جھوٹ نہ بناؤ ورنہ وہ تمہیں عذاب سے فنا کر دے گا اور جو جھوٹ بناتا ہے وہ نامراد رہتا ہے۔

ہو۔ اور ایک یہ کہ ہموار ہو۔ مگر امر اول تو ایک بہت کمزور سی بات ہے اور دوسری بات کوئی ذکر کے قابل شے نہیں۔ تیسرے معنی یوں بیان کیے گئے ہیں کہ ایسی جگہ ہو جہاں ہم اور تم برابر ہوں، یعنی حاکم اور رعیت کا جو فرق ہے وہ اس میدان میں نہ ہوگا۔ (ر) کیونکہ اس اجتماع کی غرض تحقیق حق تھی۔ اور یہی معنی یہاں موزوں ہیں۔ یہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی نرم گفتگو کا نتیجہ تھا کہ فرعون تحقیق حق پر اس طرح راضی ہو گیا اور گو وہ خود محروم رہا مگر اس کی قوم میں سے کئی لوگ ایمان لے آئے۔

2077- ﴿يَوۡمُ الزِّيۡنَةِ﴾ سے مراد وہ دن ہے جس میں لوگ زینت کرتے ہیں اور یہ نوروز یا کوئی میلہ یا کوئی اور جشن کا دن ہو سکتا ہے۔

ضُحًى۔ ضُحیٰ دھوپ کا پھیل جانا اور دن کا امتداد ہے اور اس وقت کو بھی جب دھوپ پھیل جائے ضحیٰ کہتے ہیں یعنی چاشت کا وقت۔ اور ضَحَی یَضحٰی کے معنی ہیں دھوپ کے سامنے ہونا ﴿وَ اَنَّكَ لَا تَظۡمَؤُا فِيۡهَا وَ لَا تَضۡحٰى ﴿۱۱۹﴾﴾ [119] سو یرے کا وقت مقرر کرنا بتاتا ہے کہ یہ مجمع بہت دیر تک رہنا تھا۔ اس لیے سویرے سے لوگوں کو جمع کیا گیا۔

2078- **فرعون کی تدابیر مختلفہ:** ﴿فَجَمَعَ كَيۡدَهٗ﴾ جَمَعَ ایک چیز کا بعض کو بعض کے قریب کر کے ملا دینا ہے اور [جَمَعَ اَمۡرَهٗ] اور اَجۡمَعَ کے لیے [دیکھو نمبر: 1419]۔ اور یہاں ﴿فَجَمَعَ كَيۡدَهٗ﴾ ہے۔ اور آگے آتا ہے ﴿فَاَجۡمِعُوۡا كَيۡدَكُمۡ﴾ تو اس کے معنی احکام و عزیمت کیے گئے ہیں۔ یعنی ایک امر کو پختہ اور مضبوط کرنا اور ﴿فَجَمَعَ كَيۡدَهٗ﴾ کے معنی بھی اسی طرح ہوں گے یعنی اپنی تدبیر سے کسی بات کو باقی نہ چھوڑا۔ اور بعض نے جمع اور اجماع میں یہ فرق کیا ہے کہ جمع ایک چیز کا دوسری کے ساتھ ملانا ہے اور اجماع ایک پراگندہ چیز کے اجزا کو اکٹھا کرنا۔ (ل) تو اس لحاظ سے ﴿فَجَمَعَ كَيۡدَهٗ﴾ کے معنی یہ ہوئے کہ جتنی تدبیریں کر سکتا تھا وہ سب کیں۔ اور ﴿فَاَجۡمِعُوۡا كَيۡدَكُمۡ﴾ میں مراد یہ ہوئی کہ اس بات کو پختہ اور مضبوط کرو۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ شاید وہاں ایک سے زیادہ رنگوں میں مقابلہ ہوا ہو۔ یعنی کچھ ہاتھ کے کرتب کے علاوہ تقریریں وغیرہ بھی ہوئی ہوں۔

فَتَنَازَعُوْٓا اَمْرَهُمْ بَيْنَهُمْ وَ اَسَرُّوا النَّجْوٰى ﴿۶۲﴾

تب انہوں نے اپنے معاملہ میں باہم جھگڑا کیا اور مشورے کو مخفی رکھا۔ (2079)

قَالُوْٓا اِنْ هٰذٰنِ لَسٰحِرٰنِ يُرِيْدٰنِ اَنْ يُّخْرِجٰكُمْ مِّنْ اَرْضِكُمْ بِسِحْرِهِمَا وَ يَذْهَبَا بِطَرِيْقَتِكُمُ الْمُثْلٰى ﴿۶۳﴾

انہوں نے کہا یہ دو جادوگر ہیں (جو) چاہتے ہیں کہ اپنے جادو سے تمہیں تمہارے ملک سے نکال دیں، اور تمہارے عمدہ طریقہ کو مٹا دیں۔ (2080)

2079- **حضرت موسیٰ علیہ السلام کی تقریر کا اثر:** اس سے پہلی آیت میں ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان کو سمجھایا کہ افترا نہ کریں۔ اسی کا اثر یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان میں باہم کچھ اختلاف ہوا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے یقیناً وہاں کوئی تقریر کی ہے۔ اور یہی اصل بات ہے جو کبھی فرعون کے سرداروں اور کبھی ساحروں کے دلوں کو کھائے چلی جاتی ہے۔ اور یہ ہونا بھی ضروری تھا اس لیے کہ ﴿اشْرَحْ لِيْ صَدْرِيْ﴾ اور ﴿احْلُلْ عُقْدَةً مِّنْ لِّسَانِيْ﴾ کی دعا بے کار تھی اگر اصل مقابلہ دلائل میں نہ تھا اور قبل اس کے کہ ساحر اپنے ہاتھ کے کرتب دکھائیں ان کے دل حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دلائل حقہ سے کھائے گئے تھے۔ چنانچہ آخر پر وہ کہتے بھی ہیں ﴿مَآ اَكْرَهْتَنَا عَلَيْهِ مِنَ السِّحْرِ﴾ [73]۔ جس سے معلوم ہوا کہ فرعون نے مجبور کر کے ان سے وہ شعبدہ بازی کرائی جس کا ذکر آگے آتا ہے۔ وہ خود اس پر رضامند نہ تھے۔

2080- يَذْهَبَا۔ ذَهَبٌ سونا ہے اور ذَهَبَ کے معنی چلا گیا۔ اور [ذَهَبَ بِالشَّيْءِ] اور اَذْهَبَ کے معنی ہیں اسے لے گیا، اسے دور کر دیا اور اس کا استعمال اشیاء اور معانی دونوں پر ہوتا ہے۔ جیسے ﴿اِنِّيْ ذَاهِبٌ اِلٰى رَبِّيْ﴾ [الصفات: 99:37] ''میں اپنے رب کی طرف جانے والا ہوں۔'' ﴿فَلَمَّا ذَهَبَ عَنْ اِبْرٰهِيْمَ الرَّوْعُ﴾ [هود: 74:11] ''سو جب ابراہیم سے ڈر جاتا رہا۔'' ﴿اَذْهَبَ عَنَّا الْحَزَنَ﴾ [فاطر: 34:35] ''جس نے ہم سے غم دور کر دیا۔'' ﴿لِيُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ﴾ [الأحزاب: 33:33] ''تم سے ناپاکی کو دور کرے۔'' ﴿ذَهَبَ اللّٰهُ بِنُوْرِهِمْ﴾ [البقرة: 17:2] ''اللہ ان کے نور کو لے گیا۔''

طَرِيْقَةِ۔ طَرَقَ۔ اصل میں ضَرَبَ کی طرح ہے۔ مگر صرف ایک چیز کے دوسری پر مارنے کو کہا جاتا ہے۔ اور اسی سے طریق رستہ کو کہتے ہیں۔ کیونکہ اسے پیروں سے روندا جاتا ہے۔ اور پھر ہر ایک مسلک پر بولا جاتا ہے جس کو انسان اختیار کرے۔ اچھا ہو یا برا۔ اور یہاں طَرِيْقَةِ سے مراد ایسا ہی مسلک یعنی مذہب ہے۔

﴿الْمُثْلٰى﴾۔ مَثَلَ کے لیے [دیکھو نمبر: 30 و 273] اور اَمْثَلَ کے معنی وہ چیز جو افضل اور [اَقْرَبَ اِلَى الْخَيْرِ] چیزوں سے زیادہ مشابہ ہو اور [اَمَاثِلُ الْقَوْمِ] بہترین لوگوں کو کہا جاتا ہے ﴿اِذْ يَقُوْلُ اَمْثَلُهُمْ طَرِيْقَةً﴾ [104] اور مُثْلٰى اسی سے تانیث ہے۔ طریقہ مثلیٰ سے مراد ان کا مذہب اور ان کے رسوم و رواج ہیں جنہیں وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے مذہب سے افضل قرار دیتے ہیں۔

فَاَجۡمِعُوۡا كَيۡدَكُمۡ ثُمَّ ائۡتُوۡا صَفًّا ۚ وَ قَدۡ اَفۡلَحَ الۡيَوۡمَ مَنِ اسۡتَعۡلٰى ﴿۶۴﴾

اس لیے اپنی تدبیر کو پختہ کرو، پھر صف باندھ کر آؤ، اور آج وہی کامیاب ہے جو غالب ہوا۔ (2081)

قَالُوۡا يٰمُوۡسٰۤى اِمَّاۤ اَنۡ تُلۡقِىَ وَ اِمَّاۤ اَنۡ نَّكُوۡنَ اَوَّلَ مَنۡ اَلۡقٰى ﴿۶۵﴾

انہوں نے کہا، اے موسیٰ! کیا تو ڈالے گا یا ہم پہلے ڈالنے والے ہوں۔

قَالَ بَلۡ اَلۡقُوۡا ۚ فَاِذَا حِبَالُهُمۡ وَ عِصِيُّهُمۡ يُخَيَّلُ اِلَيۡهِ مِنۡ سِحۡرِهِمۡ اَنَّهَا تَسۡعٰى ﴿۶۶﴾

کہا، بلکہ تم ڈالو۔ تو اُن کی رسیاں اور ان کی لاٹھیاں ان کے جادو سے اسے ایسا خیال ہوا کہ گویا وہ دوڑ رہی ہیں۔ (2082)

2081- اِسۡتَعۡلَاء اِسۡتِعۡلَاء کے معنی طلب علو ہیں یعنی دوسروں سے اونچا یا بلند رہنے کی خواہش۔ اور یہ علو مذموم بھی ہوسکتا ہے اور طلب رفعۃ یا بلندی مرتبہ بھی اس سے مراد ہوسکتی ہے اور یہاں دونوں باتیں مراد ہوسکتی ہیں۔ (غ) اور بعض نے علا مراد لیا ہے یعنی غالب رہا۔ (ر)

2082- ﴿يُخَيَّلُ﴾۔ خَيَالٌ۔ صورت مجردہ کو کہتے ہیں (یعنی صرف ایک صورت کو) جیسے وہ صورتیں جو خواب میں نظر آتی ہیں یا شیشہ میں یا کسی چیز کے غائب ہونے کے باوجود دل میں آجاتی ہیں۔ پھر ہر ایک صورت پر بولا جاتا ہے جس کا تصور کیا جائے اور تخیل کسی چیز کے خیال کی صورت کا دل میں آنا ہے۔ (غ)

ساحروں کی رسیاں سانپ نہیں بلکہ شعبدہ بازی تھی:

[الأعراف: 116:7] میں صرف یہ ذکر ہے کہ لوگوں کو مرعوب کر دیا اور ان کی آنکھوں کو دھوکا دیا۔ یہاں حضرت موسیٰ علیہ السلام کا ذکر ہے کہ آپ کو وہ رسیاں وغیرہ دوڑتی ہوئی خیال میں گزریں۔ یہ نہیں فرمایا کہ ساحروں نے رسیوں کی قلب ماہیت کر دی تھی اور وہ فی الواقع دوڑنے لگیں۔ بلکہ صرف ان کی چالاکی سے اور دھوکا دہی سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو بھی یہ خیال گزرا کہ یہ دوڑ رہی ہیں۔ پس یہ محض چالاکی اور دھوکہ دہی تھی۔ جس طرح آج کل بھی شعبدہ باز کر لیتے ہیں۔ ساحروں کی رسیوں اور لاٹھیوں کا فی الواقع سانپ بننا قرآن شریف میں مذکور نہیں۔ مفسرین نے اس شعبدہ بازی کی کچھ تفصیلات بیان کی ہیں۔ کسی نے کہا ہے کہ ان میں پارہ بھر دیا تھا، کسی نے کہا نیچے آگ جلا دی تھی۔ یہ سب بے ضرورت باتیں ہیں۔ جس تفصیل کو اللہ تعالیٰ نے چھوڑ دیا ہے، اس کی ہمیں ضرورت نہیں۔ اور اس قسم کی شعبدہ بازیاں ایسی عام ہیں کہ کسی شخص کو یہ سمجھانے کی ضرورت نہیں، مداری ہر جگہ ایسی شعبدہ بازیاں دکھاتے رہتے ہیں۔ اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کا خیال ایسا ہی ہے جیسے آج بھی کوئی اس قسم کی شعبدہ بازی

فَاَوْجَسَ فِيْ نَفْسِهٖ خِيْفَةً مُّوْسٰى ﴿٦٧﴾

پس موسیٰ نے اپنے دل میں خوف معلوم کیا۔ (2083)

قُلْنَا لَا تَخَفْ اِنَّكَ اَنْتَ الْاَعْلٰى ﴿٦٨﴾

ہم نے کہا ڈر نہیں، تو ہی غالب ہے۔

وَ اَلْقِ مَا فِيْ يَمِيْنِكَ تَلْقَفْ مَا صَنَعُوْا ؕ اِنَّمَا صَنَعُوْا كَيْدُ سٰحِرٍ ؕ وَ لَا يُفْلِحُ السّٰحِرُ حَيْثُ اَتٰى ﴿٦٩﴾

اور جو تیرے دائیں ہاتھ میں ہے ڈال دے کہ جو انہوں نے بنایا ہے اسے نگل جائے، جو انہوں نے بنایا ہے جادوگر کی چال ہے اور جادوگر کامیاب نہیں ہوتا خواہ کہیں سے آئے۔

فَاُلْقِيَ السَّحَرَةُ سُجَّدًا قَالُوْٓا اٰمَنَّا بِرَبِّ هٰرُوْنَ وَ مُوْسٰى ﴿٧٠﴾

پس جادوگر سجدے میں گر گئے، کہنے لگے ہم ہارون اور موسیٰ کے رب پر ایمان لائے۔

قَالَ اٰمَنْتُمْ لَهٗ قَبْلَ اَنْ اٰذَنَ لَكُمْ ؕ اِنَّهٗ لَكَبِيْرُكُمُ الَّذِيْ عَلَّمَكُمُ السِّحْرَ ۚ فَلَاُقَطِّعَنَّ اَيْدِيَكُمْ وَ اَرْجُلَكُمْ مِّنْ خِلَافٍ وَّ لَاُصَلِّبَنَّكُمْ فِيْ جُذُوْعِ النَّخْلِ ۫ وَ لَتَعْلَمُنَّ اَيُّنَآ اَشَدُّ عَذَابًا وَّ اَبْقٰى ﴿٧١﴾

(فرعون نے) کہا تم اس پر ایمان لائے اس سے پہلے کہ میں تمہیں اجازت دوں یقیناً وہ تمہارا بڑا ہے جس نے تمہیں جادو سکھایا ہے۔ سو میں ضرور تمہارے ہاتھ اور تمہارے پاؤں مخالف اطراف سے کاٹ دوں گا اور تمہیں کھجوروں کے تنوں میں صلیب دوں گا اور تم جان لو گے ہم میں کون زیادہ سخت اور دیر پا عذاب دے سکتا ہے۔

قَالُوْا لَنْ نُّؤْثِرَكَ عَلٰى مَا جَآءَنَا مِنَ

انہوں نے کہا ہم تجھے اس پر ترجیح نہ دیں گے، جو

دیکھ کر خیال کرے گا۔ یہ نہیں کہا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو یقین ہو گیا تھا۔

2083 - **حضرت موسیٰؑ کا خوف:** یہ خوف اس لیے تھا کہ لوگ دھوکا نہ کھا جائیں۔ اور اللہ تعالیٰ نے تسلی دی اور بتایا ﴿اَنْتَ الْاَعْلٰى﴾ یعنی تمہارا غلبہ کھلا ہوگا اور کسی قسم کا دھوکا باقی نہ رہے گا۔

الْبَيِّنٰتِ وَ الَّذِيْ فَطَرَنَا فَاقْضِ مَآ اَنْتَ قَاضٍ ؕ اِنَّمَا تَقْضِيْ هٰذِهِ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا ﴿۷۲﴾

نشان ہمارے پاس آ چکے، اور نہ اس پر جس نے ہمیں پیدا کیا۔ سو کر گزر جو تو کرنے والا ہے۔ تو صرف اس دنیا کی زندگی کے متعلق ہی حکم چلا سکتا ہے۔

اِنَّآ اٰمَنَّا بِرَبِّنَا لِيَغْفِرَ لَنَا خَطٰيٰنَا وَ مَآ اَكْرَهْتَنَا عَلَيْهِ مِنَ السِّحْرِ ؕ وَاللّٰهُ خَيْرٌ وَّ اَبْقٰى ﴿۷۳﴾

ہم اپنے رب پر ایمان لائے تاکہ وہ ہماری خطائیں ہمیں بخش دے۔ اور وہ جادو (بھی) جس پر تو نے ہمیں مجبور کیا اور اللہ ہی بہتر ہے اور باقی رہنے والا ہے۔

الثلثة

اِنَّهٗ مَنْ يَّاْتِ رَبَّهٗ مُجْرِمًا فَاِنَّ لَهٗ جَهَنَّمَ ؕ لَا يَمُوْتُ فِيْهَا وَلَا يَحْيٰى ﴿۷۴﴾

بات یہ ہے کہ جو اپنے رب کے حضور مجرم بن کر آئے گا تو اس کے لیے دوزخ ہے وہ نہ اس میں مرے گا اور نہ زندہ رہے گا۔ (2084)

وَ مَنْ يَّاْتِهٖ مُؤْمِنًا قَدْ عَمِلَ الصّٰلِحٰتِ فَاُولٰٓئِكَ لَهُمُ الدَّرَجٰتُ الْعُلٰى ﴿۷۵﴾

اور جو کوئی اس کے حضور مومن بن کر آئے گا کہ اس نے اچھے عمل کیے ہیں تو یہی وہ لوگ ہیں جن کے لیے اونچے درجے ہیں۔

جَنّٰتُ عَدْنٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ؕ وَ ذٰلِكَ جَزٰٓؤُا مَنْ تَزَكّٰى ﴿۷۶﴾ ع 3 22 12

ہمیشگی کے باغ جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں، انہی میں رہیں گے اور یہ اس کا بدلہ ہے جو پاک ہوا۔

2084- **جہنم میں نہ موت ہے نہ زندگی:** جہنم میں موت نہیں۔ کیونکہ مر کر انسان دکھ سے چھوٹ جاتا ہے اور وہاں حیات یعنی زندگی بھی نہیں۔ اس لیے کہ اصل زندگی تو لقاء اللہ ہے ﴿اِذَا دَعَاكُمْ لِمَا يُحْيِيْكُمْ﴾ [الانفال: 8:24] ''جب وہ تم کو اس کام کے لیے بلاتا ہے جو تمہیں زندگی دیتا ہے۔'' اور وہ اہل نار کو میسر نہیں۔ اور یا اس لیے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی نعماء سے محروم ہوں گے۔ اور زندگی ان نعماء سے فائدہ اٹھانا ہے۔ جیسا کہ ﴿بَلْ اَحْيَآءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ﴾ [آل عمران: 3:169] ''بلکہ وہ زندہ ہیں اپنے رب کے پاس۔'' میں نعماء سے لذت حاصل کرنا مراد لیا گیا ہے۔ اہل نار کی حیات صرف ان کی قوت حاسہ کے لحاظ سے ہے کہ وہ عذاب کو محسوس کریں گے۔

وَ لَقَدْ اَوْحَيْنَآ اِلٰى مُوْسٰٓى ۙ اَنْ اَسْرِ بِعِبَادِيْ فَاضْرِبْ لَهُمْ طَرِيْقًا فِي الْبَحْرِ يَبَسًا ۙ لَّا تَخٰفُ دَرَكًا وَّ لَا تَخْشٰى ۝۷۷

اور ہم نے موسیٰ کی طرف وحی بھیجی کہ میرے بندوں کو راتوں رات لے جا، پھر انہیں سمندر میں خشک رستہ پر جلد لے جا، نہ تجھے پکڑا جانے کا خوف ہے اور نہ تو (غرق ہونے سے) ڈرے۔ (2085)

فَاَتْبَعَهُمْ فِرْعَوْنُ بِجُنُوْدِهٖ فَغَشِيَهُمْ مِّنَ الْيَمِّ مَا غَشِيَهُمْ ۝۷۸

تب فرعون نے ان لشکروں کے ساتھ ان کا پیچھا کیا، سو دریا نے انہیں جیسے ڈھانکنا تھا ڈھانک لیا۔

وَ اَضَلَّ فِرْعَوْنُ قَوْمَهٗ وَ مَا هَدٰى ۝۷۹

اور فرعون نے اپنی قوم کو گمراہ کیا اور سیدھا رستہ نہ دکھایا۔

2085- ﴿فَاضْرِبْ لَهُمْ طَرِيْقًا﴾۔ بعض مفسرین نے ضرب مارنے کے معنی میں لے کر یوں معنی کیے ہیں [اِضْرِبِ الْبَحْرَ بِعَصَاكَ لِيُصِيْرَ لَهُمْ طَرِيْقًا] سمندر کو اپنے عصا سے مارتا کہ وہ ان کے لیے رستہ بنا دے۔ مگر یہ الفاظ سے بہت دور نکل جانا ہے۔ بعض نے ضرب کو یہاں بمعنی اِتَّخِاذْ لے کر لَهُمْ اور طریق کو دو مفعول مانا ہے۔ (ر) اور ضَرَبَ کے معنی [اِسْرَاعَ فِي السَّيْرِ] چلنے میں جلدی کرنا لغت میں موجود ہیں۔ (ل) اور [ضَرَبَ يَعْسُوْبُ الدِّيْنَ بِذَنْبِهٖ] میں یہی معنی کیے گئے ہیں۔ یعنی فتنوں سے بھاگتا ہوا جلدی چلا گیا۔ (ل) پس ضَرَبَ کے معنی میں یہی اشارہ ہے۔

﴿يَبَسًا﴾۔ يَبْس کے لیے [دیکھو نمبر: 1544] اور يَبْس اس مکان کو کہتے ہیں جس میں پانی ہو پھر جاتا رہے۔ (غ)

حضرت موسیٰؑ کا سمندر میں خشک رستہ پر چلنا:

ان الفاظ سے اول تو یہ ثابت ہوتا ہے کہ وہ رستہ جس پر حضرت موسیٰ علیہ السلام کو بنی اسرائیل کو لے جانے کا حکم ہوا تھا ایک ہی رستہ تھا، نہ بارہ رستے۔ جیسا کہ اکثر لوگوں کا خیال ہے۔ پھر اسے طریق یا رستہ کہا ہے، جس سے معلوم ہوا کہ اور لوگ بھی وہاں سے چلتے تھے۔ کیونکہ طریق اسی کو کہا جاتا ہے جس پر لوگ چلیں۔ [دیکھو نمبر: 2080] اور یہی وجہ ہے کہ فرعون بھی اس رستہ پر چل پڑا۔ اگر وہ سمندر کی دیواریں بن کر غیر معمولی خشک جگہیں ہوتیں تو نہ ان پر طریق کا لفظ بولا جاتا نہ فرعون کبھی ان پر چلنے کی جرأت کرتا۔ پھر حضرت موسیٰ علیہ السلام کو مصر سے چلنے سے پیشتر وحی ہو جاتی ہے کہ سمندر میں خشک رستہ مل جائے گا اور يَبَس کے جو معنی امام راغب نے دیئے ہیں اس سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ وہاں سے پانی ہٹ گیا تھا۔ خواہ جوار بھاٹے سے ہو یا اور غیر معمولی اسباب سے۔

يٰبَنِيۡۤ اِسۡرَآءِيۡلَ قَدۡ اَنۡجَيۡنٰكُمۡ مِّنۡ عَدُوِّكُمۡ وَ وٰعَدۡنٰكُمۡ جَانِبَ الطُّوۡرِ الۡاَيۡمَنَ وَ نَزَّلۡنَا عَلَيۡكُمُ الۡمَنَّ وَ السَّلۡوٰى ﴿۸۰﴾

اے بنی اسرائیل ہم نے تمہیں تمہارے دشمن سے نجات دی اور طور کی بابرکت جانب کا تمہارے ساتھ عہد کیا اور تم پر من اور سلویٰ اتارا۔ (2086)

كُلُوۡا مِنۡ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقۡنٰكُمۡ وَ لَا تَطۡغَوۡا فِيۡهِ فَيَحِلَّ عَلَيۡكُمۡ غَضَبِىۡ ۚ وَ مَنۡ يَّحۡلِلۡ عَلَيۡهِ غَضَبِىۡ فَقَدۡ هَوٰى ﴿۸۱﴾

ستھری چیزوں سے کھاؤ جو ہم نے تمہیں دی ہیں اور اس میں حد سے نہ بڑھو، ورنہ میرا غضب تم پر اترے گا اور جس پر میرا غضب اترا وہ پستی میں گر گیا۔ (2087)

وَ اِنِّىۡ لَغَفَّارٌ لِّمَنۡ تَابَ وَ اٰمَنَ وَ عَمِلَ صَالِحًا ثُمَّ اهۡتَدٰى ﴿۸۲﴾

اور یقیناً میں اس کو بخشنے والا ہوں جو توبہ کرتا ہے اور ایمان لاتا ہے اور اچھا عمل کرتا ہے، پھر ہدایت پر قائم رہتا ہے۔ (2088)

2086- اَیۡمَنَ کے لیے [دیکھو نمبر: 2010] یہاں جانب کی صفت ہے اور وٰعَدۡنٰکُمۡ سے مراد وہی حضرت موسیٰ علیہ السلام کو توریت کا عطا کرنا ہے۔ ﴿وَ اِذۡ وٰعَدۡنَا مُوۡسٰۤى اَرۡبَعِيۡنَ لَيۡلَةً﴾ [البقرة: 51:2] ''اور جب ہم نے موسیٰ سے چالیس رات کا وعدہ کیا'' اور یہاں وٰعَدۡنٰکُمۡ اس لیے فرمایا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی وساطت سے توریت بنی اسرائیل کو ہی ملی تھی۔ جو کچھ نبی کو دیا جاتا ہے وہ اس کی امت کو ہی اس کے واسطہ سے دیا جاتا ہے۔

2087- ﴿تَطۡغَوۡا فِيۡهِ﴾ فِيۡهِ کی ضمیر ﴿مَا رَزَقۡنٰكُمۡ﴾ کی طرف ہے۔ هَوٰى کے معنی بلندی سے پستی کی طرف گرنا ہیں۔ [دیکھو نمبر: 152] پس مطلب یہ ہے کہ وہ اس بلند مقام سے جس کے لیے اللہ تعالیٰ نے اسے پیدا کیا تھا یعنی رضائے الٰہی کا مقام ایک نہایت پست مقام کی طرف گر گیا۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ فی الحقیقت رضائے الٰہی کا حصول سب سے بلند مقام ہے۔ جس پر انسان پہنچ سکتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی ناراضگی ہی ﴿اَسۡفَلَ سٰفِلِيۡنَ﴾ میں گر جانا ہے، اور هَوٰى کے معنی ہلاک ہو گیا بھی کیے گئے ہیں۔ اس لیے کہ بلندی سے پستی میں گرنا موجب ہلاکت ہے۔

2088- اهۡتَدٰى۔ اِهۡتِدَآءٌ (جو هَدٰى سے ہے) اس سے مخصوص ہے جس کا انسان اختیار کر کے طریق پر قصد کرتا ہے۔ امور دنیوی میں ہو یا اخروی میں ﴿جَعَلَ لَكُمُ النُّجُوۡمَ لِتَهۡتَدُوۡا بِهَا﴾ [الأنعام: 97:6] ''تمہارے لیے ستارے بنائے تاکہ ان کے ذریعے سے راہ پاؤ'' ﴿لَا يَسۡتَطِيۡعُوۡنَ حِيۡلَةً وَّ لَا يَهۡتَدُوۡنَ سَبِيۡلًا﴾ [النسآء: 98:4] ''نہ وہ حیلہ کر سکتے ہیں اور نہ راستہ پا سکتے ہیں'' اور کبھی طلب ہدایت پر بولا جاتا ہے ﴿وَ اِذۡ اٰتَيۡنَا مُوۡسَى الۡكِتٰبَ وَ الۡفُرۡقَانَ لَعَلَّكُمۡ تَهۡتَدُوۡنَ ۝﴾ [البقرة: 53:2] ''اور جب ہم

وَ مَاۤ اَعۡجَلَكَ عَنۡ قَوۡمِكَ يٰمُوۡسٰى ﴿۸۳﴾

اور اے موسیٰ کیا چیز تجھے اپنی قوم سے (آگے) جلدی لے آئی۔

قَالَ هُمۡ اُولَآءِ عَلٰۤى اَثَرِىۡ وَ عَجِلۡتُ اِلَيۡكَ رَبِّ لِتَرۡضٰى ﴿۸۴﴾

کہا، وہ بھی میرے نقش قدم پر ہیں۔ اور اے میرے رب! میں نے تیری طرف جلدی کی تاکہ تو راضی ہو۔ (2089)

قَالَ فَاِنَّا قَدۡ فَتَنَّا قَوۡمَكَ مِنۡۢ بَعۡدِكَ وَ اَضَلَّهُمُ السَّامِرِىُّ ﴿۸۵﴾

کہا، تو ہم نے تیری قوم کو تیرے پیچھے فتنہ میں ڈالا، اور سامری نے انہیں گمراہ کیا۔ (2090)

نے موسیٰ کو کتاب اور فرقان دیا، تاکہ تم ہدایت پاؤ۔'' ﴿وَ لِاُتِمَّ نِعۡمَتِىۡ عَلَيۡكُمۡ وَ لَعَلَّكُمۡ تَهۡتَدُوۡنَ﴾ [البقرة: 150:2] ''اور تاکہ میں نعمت تم پر پوری کروں اور تاکہ تم ہدایت پالو۔'' اور اِهۡتَدَاءٌ کسی صاحب ہدایت کا اقتدا کرنا بھی ہے ﴿اَوَ لَوۡ كَانَ اٰبَآؤُهُمۡ لَا يَعۡقِلُوۡنَ شَيۡـًٔا وَّ لَا يَهۡتَدُوۡنَ﴾ [البقرة: 170:2] ''کیا اگرچہ ان کے بڑے نہ کچھ عقل سے کام لیتے ہوں اور نہ ہدایت پر ہوں۔'' یعنی کسی عالم (یا ہدایت) کی پیروی نہ کرتے تھے۔ اور ﴿فَمَنِ اهۡتَدٰى فَاِنَّمَا يَهۡتَدِىۡ لِنَفۡسِهٖ﴾ [يونس: 108:10] ''سو جو کوئی راہ پر چلتا ہے وہ اپنے بھلے کو ہی راہ پر چلتا ہے۔'' میں اِهۡتَدَاءٌ میں کئی وجوہ داخل ہیں۔ یعنی طلب ہدایت اور اقتدائے ہدایت اور قصد ہدایت۔ اور یہاں اِهۡتَدٰى کے معنی ہیں ہدایت کی طلب میں مداومت اختیار کرتا ہے یعنی اس میں لگا رہتا ہے اور اس کا قصد کرنے میں سستی نہیں کرتا اور نافرمانی کی طرف نہیں لوٹتا۔ (غ)

2089- یہ اس واقعہ کی طرف اشارہ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنی قوم کے آدمیوں کو جو ساتھ لائے تھے پہاڑ کے نیچے چھوڑ کر خود اوپر چلے آئے تھے۔ ﴿وَ اخۡتَارَ مُوۡسٰى قَوۡمَهٗ سَبۡعِيۡنَ رَجُلًا لِّمِيۡقَاتِنَا﴾ [الأعراف: 155:7] ''اور موسیٰ نے اپنے قوم کے ستر آدمی ہمارے وعدہ کے لیے چن لیے۔'' اور اس سوال میں کوئی تنبیہ کرنا مقصود نہیں بلکہ صرف اس امر کا اظہار ہے کہ انبیاء کے سب کام رضائے الٰہی کے لیے ہوتے ہیں۔ اور بعض کے نزدیک ﴿هُمۡ اُولَآءِ عَلٰۤى اَثَرِىۡ﴾ سے مراد یہ ہے کہ وہ میرے قریب ہی ہیں اور مراد ساری قوم ہے۔ یعنی میری قوم بھی مجھ سے کچھ دور نہیں۔ اور بعض کے نزدیک ﴿عَلٰۤى اَثَرِىۡ﴾ سے مراد [عَلٰى دِيۡنِىۡ] ہے، یعنی وہ میرے ہی دین پر ہیں۔ (ر)

2090- ﴿السَّامِرِىُّ﴾۔ سُمۡرَة اس رنگ کو کہتے ہیں جو سفیدی اور سیاہی کے درمیان ہو (یعنی گندم گوں) اور سَمَر رات کی تاریکی کو کہتے ہیں۔ اور رات کو کہانی بیان کرنے کو بھی۔ اور سَامِرٌ ایسی کہانیوں کا بیان کرنے والا ہے اور سامری ایک شخص کی طرف منسوب ہے۔ (غ) اور سامرۃ بنی اسرائیل کے قبیلوں میں سے ایک قبیلہ ہے جو بعض امور دینی میں یہود سے اختلاف رکھتے تھے۔ اور

فَرَجَعَ مُوْسٰۤى اِلٰى قَوْمِهٖ غَضْبَانَ اَسِفًا ۚ قَالَ يٰقَوْمِ اَلَمْ يَعِدْكُمْ رَبُّكُمْ وَعْدًا حَسَنًا ۬ؕ اَفَطَالَ عَلَيْكُمُ الْعَهْدُ اَمْ اَرَدْتُّمْ اَنْ يَّحِلَّ عَلَيْكُمْ غَضَبٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ فَاَخْلَفْتُمْ مَّوْعِدِىْ ﴿۸۶﴾

سوموسیٰ اپنی قوم کی طرف ناراض افسوس کرتا ہوا لوٹا، کہا، اے میری قوم! کیا تمہارے رب نے تم سے اچھا وعدہ نہ کیا تھا، تو کیا وہ وعدہ تمہیں لمبا معلوم ہوا، بلکہ تم نے یہ ارادہ کرلیا کہ تم پر تمہارے رب کا غضب اترے، سوتم نے میرے (ساتھ) وعدہ کا خلاف کیا۔ (2091)

قَالُوْا مَاۤ اَخْلَفْنَا مَوْعِدَكَ بِمَلْكِنَا وَ لٰكِنَّا حُمِّلْنَاۤ اَوْزَارًا مِّنْ زِيْنَةِ الْقَوْمِ فَقَذَفْنٰهَا فَكَذٰلِكَ اَلْقَى السَّامِرِىُّ ﴿۸۷﴾

انہوں نے کہا ہم نے تیرے (ساتھ) وعدہ کا خلاف اپنے اختیار سے نہیں کیا بلکہ ہم پر قوم کی زینت سے بوجھ ڈالا گیا سو ہم نے اسے پھینک دیا اور ایسا ہی سامری نے (خیال) ڈالا۔ (2092)

سامری انہی کی طرف منسوب ہے۔ (ل) اور بعض مفسرین نے سامری کے متعلق لکھا ہے کہ وہ ایک قبطی تھا اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ مصر سے نکلا تھا۔ اور وہ ایک منافق آدمی تھا۔ (ر) اور یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی طرف منسوب ہے۔

2091- ﴿وَعْدًا حَسَنًا﴾ سے مراد بعض نے توریت کا دینا لیا ہے اور بعض نے وہ وعدے جو اہل طاعت کے ساتھ کیے جاتے ہیں اور یہی درست معلوم ہوتا ہے۔ ﴿فَطَالَ عَلَيْكُمُ الْعَهْدُ﴾ سے مراد وہ وعدہ کا زمانہ لیا گیا ہے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام ان سے الگ ہوئے تھے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ زمانہ اتنا لمبا تو نہیں تھا کہ تم بھول جاتے۔ پس تم نے عمداً خلاف ورزی کی۔

2092- مَلک اور مِلک کے ایک ہی معنی ہیں۔ (غ) یعنی اختیار یعنی اپنی مرضی سے ایسا نہیں کیا بلکہ کسی کے ورغلانے سے۔

اَلْقٰى۔ اِلقاء کے معنی کسی چیز کا وہاں پھینکنا ہیں جہاں وہ تمہارے سامنے ہو (کیونکہ اس کا مادہ لقی ہے) اور پھر عام ہوگیا ہے یعنی ہر طرح کا پھینکنا۔ ﴿اِمَّاۤ اَنْ تُلْقِيَ وَ اِمَّاۤ اَنْ نَّكُوْنَ اَوَّلَ مَنْ اَلْقٰى﴾ [65] اور پھر کلام، قول، سلام، دوستی کے پیش کرنے پر بھی یہی لفظ آجاتا ہے ﴿فَاَلْقَوْا اِلَيْهِمُ الْقَوْلَ﴾ [النحل: 86:16] ''تو وہ بات کو ان (کے منہ) پر ماریں گے۔'' ﴿وَ اَلْقَوْا اِلَى اللّٰهِ يَوْمَئِذِ ِالسَّلَمَ﴾ [النحل: 87:16] ''اور اس دن اللہ کے سامنے فرمانبرداری سے پیش ہوں گے۔'' ﴿اَوْ اَلْقَى السَّمْعَ﴾ [قٓ: 37:50] ''یا وہ کان لگاتا ہے۔'' (غ) اور چونکہ یہاں مفعول مذکور نہیں اور زیورات کے ڈالنے پر قَذَفَ استعمال کیا ہے [دیکھو نمبر: 2062] اور یہاں اس کے مقابل پر اَلْقٰى ہے۔ اس لیے مراد یہاں یہی معلوم ہوتی ہے کہ یہ بات سامری نے ہمارے سامنے پیش کی اور اس کے مطابق تفاسیر میں ایک قول بھی ہے [فَمَثَلَ ذٰلِكَ الَّذِىْ ذِكَرْنَاهُ لَكَ اَلْقَى السَّامِرِىُّ

فَاَخْرَجَ لَهُمْ عِجْلًا جَسَدًا لَّهٗ خُوَارٌ فَقَالُوْا هٰذَاۤ اِلٰهُكُمْ وَ اِلٰهُ مُوْسٰى ۫ فَنَسِيَ ﴿۸۸﴾

پس ان کے لیے ایک بچھڑا نکال کھڑا کیا (محض) ایک جسم جس سے بچھڑے کی آواز نکلتی تھی۔ تو انہوں نے کہا یہ تمہارا معبود ہے اور موسیٰ کا معبود ہے مگر (موسیٰ) بھول گیا۔ (2092) ؎

اَفَلَا يَرَوْنَ اَلَّا يَرْجِعُ اِلَيْهِمْ قَوْلًا ۙ وَّ لَا يَمْلِكُ لَهُمْ ضَرًّا وَّ لَا نَفْعًا ﴿۸۹﴾ ع 4 13 13

کیا وہ غور نہ کرتے تھے کہ وہ ان کی بات کا جواب نہیں دیتا اور نہ ان کے لیے کسی نقصان کا اختیار رکھتا ہے اور نہ نفع کا۔

اِلَيْنَا وَ قَرَّرَهُ عَلَيْنَا] (ر)

﴿اَوْزَارًا مِّنْ زِيْنَةِ الْقَوْمِ﴾ سے وہی مراد ہے جو دوسری جگہ ﴿مِنْ حُلِيِّهِمْ﴾ [الأعراف: 148:7] سے مراد ہے یعنی زیورات۔ اور ﴿زِيْنَةِ الْقَوْمِ﴾ کے لفظ سے مفسرین نے عام طور پر یہ مراد لیا ہے کہ یہ وہ زیورات تھے جو بنی اسرائیل قبطیوں سے عاریتاً لے آئے تھے۔ جیسا کہ [خروج: 35:12] میں ذکر ہے۔ مگر قرآن شریف کے الفاظ جہاں ان زیورات کو [الأعراف: 148] میں حُلِيِّهِمْ یعنی بنی اسرائیل کے زیورات قرار دیا ہے اس توجیہ کو صحیح نہیں ٹھہراتے۔ اور بعض نے اسے مالِ غنیمت قرار دے کر پھر خود ہی اعتراض کیا ہے کہ مال غنیمت کا لینا ان کے لیے جائز نہ تھا اور مال غنیمت اسے یوں بنایا ہے کہ جب فرعون اور اس کے ساتھی سمندر میں غرق ہو گئے تو ان کے زیورات سمندر نے ساحل پر پھینک دیئے اور وہ بنی اسرائیل نے لے لیے۔ مگر یہ سب دور از قیاس باتیں ہیں اور صحیح بات صرف اس قدر معلوم ہوتی ہے کہ فرعونیوں کی نقل کر کے بنی اسرائیل کے خیالات بھی زینت کے ظاہری سامانوں یعنی زیورات وغیرہ کی طرف بہت جھک گئے تھے۔ اس لیے یہ تجویز کہ زیورات کو اتار دیا جائے سب کو اچھی بھی معلوم ہوئی۔ پس ﴿زِيْنَةِ الْقَوْمِ﴾ سے مراد اہل مصر کی ظاہری آرائش کے سامان ہیں۔ اور حَمَلْنَا میں یہ اشارہ ہے کہ بنی اسرائیل بھی ان کی نقل کر کے اسی مرض میں مبتلا ہو گئے اور زیورات وغیرہ کا شوق بہت بڑھ گیا۔ اسی لیے دوسری جگہ حُلِيِّهِمْ فرمایا۔ پھر یا تو ان زیورات سے بچھڑا بنایا گیا اور یا کوئی بت بچھڑے کا بنا کر ان زیورات سے اسے آراستہ کیا گیا اور بتوں کو زیورات پہنانے کا دستور بھی بت پرست قوموں میں پایا جاتا ہے۔

2092؎- **مسلمان اور عجل یورپ:** زیورات سے بنے ہوئے یا زیورات سے آراستہ بچھڑے کی پرستش میں کیا اشارہ ہے؟ کیونکہ بنی اسرائیل کے واقعات کا ذکر تو مسلمانوں کی ہدایت کے لیے کیا۔ اس کی تصریح قرآن کریم نے خود اس سورت میں کر دی ہے۔ جہاں فرمایا ﴿لَا تَمُدَّنَّ عَيْنَيْكَ اِلٰى مَا مَتَّعْنَا بِهٖۤ اَزْوَاجًا مِّنْهُمْ زَهْرَةَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا﴾ [131] یعنی جس طرح بنی اسرائیل فرعون اور اس کے ساتھیوں کی نقل کر کے دنیوی آرائش کے سامانوں پر گر گئے تھے مسلمان ایسا نہ کریں۔ مگر آج یہی

وَ لَقَدۡ قَالَ لَهُمۡ هٰرُوۡنُ مِنۡ قَبۡلُ يٰقَوۡمِ اِنَّمَا فُتِنۡتُمۡ بِهٖ ۚ وَ اِنَّ رَبَّكُمُ الرَّحۡمٰنُ فَاتَّبِعُوۡنِىۡ وَ اَطِيۡعُوۡۤا اَمۡرِىۡ ﴿۹۰﴾

اور ہارون نے ان سے پہلے ہی کہہ دیا تھا اے میری قوم! تم اس سے صرف آزمائش میں ڈالے گئے ہو اور تمہارا رب بہت رحم کرنے والا ہے۔ سو میری پیروی کرو اور میرے حکم کی فرمانبرداری کرو۔ (2093)

قَالُوۡا لَنۡ نَّبۡرَحَ عَلَيۡهِ عٰكِفِيۡنَ حَتّٰى يَرۡجِعَ اِلَيۡنَا مُوۡسٰى ﴿۹۱﴾

انہوں نے کہا ہم اس کی عبادت میں لگے رہیں گے جب تک کہ موسیٰ ہماری طرف لوٹ کر نہ آئے۔

قَالَ يٰهٰرُوۡنُ مَا مَنَعَكَ اِذۡ رَاَيۡتَهُمۡ ضَلُّوۡۤا ﴿۹۲﴾

(موسیٰ نے) کہا، اے ہارون کس چیز نے تجھے روکا جب تو نے انہیں دیکھا تھا کہ گمراہ ہو گئے؟

اَلَّا تَتَّبِعَنِ ؕ اَفَعَصَيۡتَ اَمۡرِىۡ ﴿۹۳﴾

کہ تو نے میری اتباع نہ کی۔ تو کیا تو نے میرے حکم کی نافرمانی کی ہے؟ (2094)

حالت مسلمانوں کی ہے کہ وہ فی الحقیقت عجل یورپ کی پرستش کر رہے ہیں اور ہر بات میں ان کی نقل اتارتے ہیں۔ فی الواقع یورپ کی ظاہری ٹیپ ٹاپ ایک عجل ہے اور اس کی پرستش یہی ہے کہ مسلمان بھی اپنے تمام کاروبار میں دنیا اور اس کے مال اور اس کی آرائشوں کو اپنی زندگی کی غرض و غایت سمجھتے ہیں۔

2093- **حضرت ہارونؑ کی عصمت اور بائبل کے بیان کی تردید:** یہاں قرآن شریف نے نہایت صفائی سے بائبل کے اس قصہ کی تردید کی ہے کہ حضرت ہارون علیہ السلام بچھڑے کے بنانے اور عبادت میں شریک تھے۔ یوں نہ صرف ان کی عدم شرکت کا ذکر کیا بلکہ یہ بھی بتایا کہ حضرت ہارون علیہ السلام نے بنی اسرائیل کو گوسالہ پرستی سے روکا بھی تھا۔ ایسے ایسے مقامات سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ قرآن کریم بائبل کے قصوں کو نقل نہیں کرتا بلکہ اس کلام پاک کا سرچشمہ کوئی اور ہے اور وہ بائبل کی غلطیوں کی اصلاح کرتا ہے اور یہاں حضرت ہارون علیہ السلام کی عصمت کو ثابت کیا ہے۔

2094- اتباع نہ کرنے سے مراد یہ ہے کہ ایسے حالات میں تم نے وہ کچھ کیوں نہ کیا جو میں کرتا۔ اور بعض کے نزدیک یہ مراد ہے کہ تو ان لوگوں کو ساتھ لے کر جو شرک سے بچے رہے تھے میرے پیچھے کیوں نہ آ گیا۔ مگر پہلے معنی زیادہ صاف ہیں۔ اور مطلب یہ ہے کہ ان لوگوں سے تعلق منقطع کر دیتا یا ایسا فساد ڈالنے والے کو قرار واقعی سزا دیتا یا سختی سے روک دیتا۔

قَالَ يَبْنَؤُمَّ لَا تَاْخُذْ بِلِحْيَتِيْ وَ لَا بِرَاْسِيْ ۚ اِنِّيْ خَشِيْتُ اَنْ تَقُوْلَ فَرَّقْتَ بَيْنَ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ وَ لَمْ تَرْقُبْ قَوْلِيْ ﴿۹۴﴾

کہا، اے میری ماں کے بیٹے میری داڑھی اور میرا سر نہ پکڑ، میں ڈر گیا کہ تو کہے گا تو نے بنی اسرائیل میں تفرقہ ڈال دیا اور میری بات کا پاس نہ کیا۔[2095]

قَالَ فَمَا خَطْبُكَ يٰسَامِرِيُّ ﴿۹۵﴾

(موسیٰ نے) کہا، اے سامری تیرا کیا معاملہ ہے۔

قَالَ بَصُرْتُ بِمَا لَمْ يَبْصُرُوْا بِهٖ فَقَبَضْتُ قَبْضَةً مِّنْ اَثَرِ الرَّسُوْلِ فَنَبَذْتُهَا وَ كَذٰلِكَ سَوَّلَتْ لِيْ نَفْسِيْ ﴿۹۶﴾

اس نے کہا میں نے وہ کچھ جانا جو انہوں نے نہیں جانا۔ پس میں نے رسول کے نقش قدم سے کچھ حاصل کیا پھر اسے پھینک دیا اور ایسا ہی میرے دل نے مجھے (یہ کام) اچھا کر دکھایا۔[2096]

2095- [دیکھو نمبر: 1159]۔ حضرت ہارون علیہ السلام کو یہ خیال تھا کہ اگر انہوں نے سختی کی تو قوم میں فساد پڑ جائے گا۔ کیونکہ دوسرا گروہ اور ان کے سرغنے بہت زبردست تھے۔ جیسا کہ اعراف میں ہے ﴿كَادُوْا يَقْتُلُوْنَنِيْ﴾ [150:7] ''قریب تھا کہ مجھے مار دیں۔''

2096- بَصُرْتُ۔ بَصَر کے لیے [دیکھو نمبر: 121] جب ظاہری آنکھ سے دیکھنا مراد ہو تو کہتے ہیں اَبصَرتُ اور جب قلب کی قوت مدرکہ کا ذکر ہو تو کہتے ہیں اَبصَرتُہ اور بَصُرتُ بہ اور بَصُرت حاسہ میں یعنی آنکھ سے دیکھنے کے لیے بہت ہی کم استعمال ہوتا ہے۔ جب تک کہ اس کے ساتھ رؤیت قلب بھی نہ ہو۔ ﴿لِمَ تَعْبُدُ مَا لَا يَسْمَعُ وَ لَا يُبْصِرُ﴾ [مریم: 42:19] ''تو کیوں اس کی عبادت کرتا ہے جو نہ سنتا ہے اور نہ دیکھتا ہے۔'' ﴿اَبْصَرْنَا وَ سَمِعْنَا﴾ [السجدۃ: 12:32] ''ہم نے دیکھ لیا اور سن لیا۔'' (غ) اور اسی کے مطابق زجاج کا قول ہے یعنی بَصُر بالشیء کے معنی ہیں عَلِمَہٗ اسے جانا اور اَبصَرَ کے معنی ہیں دیکھا۔

قَبَضْتُ۔ قبض کے معنی کے لیے [دیکھو نمبر: 314]۔ مگر محض کسی چیز کے حاصل کرنے پر بھی بولا جاتا ہے۔ گو اس میں ہاتھ سے لینا نہ ہو۔ (غ) اور قَبْضَةً ایک مرتبہ حاصل کرنا ہے۔

سامری کا بچھڑا بنانا اور حضرت جبریلؑ کی گھوڑی کا بے بنیاد قصہ:

یہاں بہت سے زواید داخل کر کے یوں معنی کیے گئے ہیں کہ میں نے رسول یعنی جبریل کے گھوڑے کے پاؤں کے نیچے کی مٹی لے لی اور اسے آگ میں ڈالا تو وہ بچھڑا بن گیا۔ معلوم نہیں کہ اس عجیب کہانی کا ماخذ کیا ہے۔ اول تو یہاں جبریل کا ذکر نہیں۔ پھر جبریل کا گھوڑا درمیان میں زبردستی داخل کیا جاتا ہے۔ پھر مٹی کا کوئی ذکر نہیں۔ اَثَرِ کے معنی مٹی نہیں بلکہ نقش ہیں خواہ وہ نقش ظاہری ہو یا معناً۔ پھر آگ میں ڈالنے کا کوئی ذکر نہیں۔ پھر بچھڑا بننے کا کوئی ذکر نہیں۔ پھر یہ کس قدر عجیب بات ہے کہ سامری کو

قَالَ فَاذْهَبْ فَاِنَّ لَكَ فِي الْحَيٰوةِ اَنْ تَقُوْلَ لَا مِسَاسَ ۖ وَ اِنَّ لَكَ مَوْعِدًا لَّنْ تُخْلَفَهٗ ۚ وَ انْظُرْ اِلٰٓى اِلٰهِكَ الَّذِيْ ظَلْتَ عَلَيْهِ عَاكِفًا ؕ لَنُحَرِّقَنَّهٗ ثُمَّ لَنَنْسِفَنَّهٗ فِي الْيَمِّ نَسْفًا ﴿۹۷﴾

کہا، تو چلا جا تیرے لیے زندگی میں یہ (سزا) ہے کہ تو کہتا رہے، چھونا نہیں[2097] اور تیرے لیے ایک (اور) وعدہ ہے جس کے خلاف تجھ سے نہ ہوگا اور اپنے اس معبود کو دیکھ جس کی عبادت میں تو لگا ہوا تھا ہم اسے جلا دیں گے، پھر اسے دریا میں اچھی طرح بکھیر دیں گے۔[2098]

منافق بھی کہا جاتا ہے اور ساتھ ہی اس کو ایسی قوت کا مالک بھی سمجھا جاتا ہے کہ جبریل اور اس کا گھوڑا جو مخلص مومنوں کو نظر نہ آئے وہ منافق سامری کو نظر آ گیا۔ پھر یہ کہاں سے معلوم ہوا کہ جبریل کے گھوڑے کے پاؤں کے نیچے کی مٹی سے زیورات کا بت بن جایا کرتا ہے اور اس میں سے عجیب وغریب آوازیں آنے لگتی ہیں۔ یا کیا اسے سامری کا معجزہ کہا جائے گا۔ غرض یہ کہانی کسی طرح پر قابل قبول نہیں۔ رسول خود حضرت موسیٰ علیہ السلام ہیں اور ان کے اثر سے کچھ لینا صاف بتاتا ہے کہ ان کی تعلیم کو اس نے پورے طور سے قبول نہیں کیا بلکہ اس کو بہت تھوڑا قبول کیا۔ اور بَصُر کے معنی قلب کی قوت مدرکہ سے لینا ہیں۔ پس وہ اپنی بڑائی ظاہر کرتا ہے کہ یہ لوگ جو بلا سوچے سمجھے تمہاری تعلیم کی پیروی کرتے چلے جاتے ہیں میں ان میں سے نہیں بلکہ صاحب علم ہوں۔ کچھ اپنے مطلب کی بات لے لی۔ پھر اسے بھی پس پشت پھینک دیا ﴿فَنَبَذْتُهَا وَكَذٰلِكَ سَوَّلَتْ لِيْ نَفْسِيْ﴾ اور یہ سب کچھ اس کے نفس کی تزیین تھی۔ یعنی میرے دل نے مجھے یہ کام اچھا کر کے دکھایا اس لیے میں نے ایسا ہی کیا۔ یہی قول ابو مسلم کا ہے اور یا مراد یہ ہے کہ زیورات کا بنی اسرائیل سے لینا تو رسول کی تعلیم کا کچھ اثر تھا مگر پھر اسے پھینک دیا اور انہی زیورات کے ذریعہ سے قوم کو مشرک بنا دیا۔

2097- **سامری کا لوگوں سے میل جول روکا جانا:** ﴿لَا مِسَاسَ﴾ مَسّ کے لیے [دیکھو نمبر: 305] اور مِساس ایک دوسرے کو چھونا اور ﴿لَا مِسَاسَ﴾ کے معنی ہیں تم کسی سے مخالطت نہ کرو، یعنی میل جول نہ رکھو۔ سامری کا میل جول دوسرے لوگوں سے بطور سزا روک دیا گیا۔ (ل) پس معلوم ہوا کہ سامری کو یہ سزا دی گئی تھی کہ لوگوں سے اس کا میل جول روک دیا گیا اور ﴿لَا مِسَاسَ﴾ کہنے سے مراد بظاہر یہی ہے کہ وہ کسی سے ملے نہیں اور قول اس معنی میں آ سکتا ہے [دیکھو نمبر: 45]۔ اور اگر منہ سے کہنا ہی مراد ہے تو بھی غرض یہی ہے کہ اگر کوئی اس سے کلام کرنا بھی چاہے تو بھی وہ کہہ دے کہ اسے یہ حکم نہیں۔

2098- ﴿ظَلْتَ﴾ اصل میں ظَلَلْتُ ہے۔ ایک لام حذف ہو گیا ہے۔ [دیکھو نمبر: 1751]۔

نُحَرِّقَنَّ۔ حَرَق آگ یا آگ کا شعلہ ہے اور اَحرَقَه کے معنی ہیں جلایا اور حَرَّقَه کثرت کے لیے ہے اور اِحتَرَقت حدیث میں آیا ہے جہاں اس کے معنی ہیں هَلَكَت یعنی ہلاک ہو گئی۔ اور دوسری حدیث میں ہے [أُوحِيَ إِلَيَّ أَنْ أُحْرِقَ قُرَيْشًا] (سنن النسائی الکبری، جلد5، صفحہ 26) جہاں أُحرِقَ کے معنی أُهلِك یعنی انہیں ہلاک کر دوں اور [حَرَقَ نَابَه] (يَحرِقُ)

اِنَّمَاۤ اِلٰهُكُمُ اللّٰهُ الَّذِیْ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ؕ وَسِعَ كُلَّ شَیْءٍ عِلْمًا ﴿۹۸﴾

تمہارا معبود صرف اللہ ہے، جس کے سوائے کوئی معبود نہیں، اس کا علم ہر چیز پر پھیلا ہوا ہے۔

كَذٰلِكَ نَقُصُّ عَلَیْكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ مَا قَدْ سَبَقَ ۚ وَقَدْ اٰتَیْنٰكَ مِنْ لَّدُنَّا ذِكْرًا ﴿۹۹﴾ۖ

اسی طرح ہم تجھ پر اس کی خبر بیان کرتے ہیں، جو پہلے گزر چکا، اور ہم نے تجھے اپنے پاس سے ذکر دیا ہے۔

مَنْ اَعْرَضَ عَنْهُ فَاِنَّهٗ یَحْمِلُ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ وِزْرًا ﴿۱۰۰﴾ۙ

جو کوئی اس سے منہ پھیرے گا تو وہ قیامت کے دن بوجھ اٹھائے گا۔

خٰلِدِیْنَ فِیْهِ ؕ وَسَآءَ لَهُمْ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ حِمْلًا ﴿۱۰۱﴾ۙ

اسی میں رہیں گے اور قیامت کے دن ان کا بوجھ برا ہوگا۔

کے معنی ہیں دانت پیسے یہاں تک کہ اس کی آواز سنی گئی اور [وَحَرَقَ الْحَدِيْدَ بِالْمِبْرَدِ يَحْرُقُهُ] اور حَرَّقَهٗ کے معنی ہیں لوہے کو سوہان سے کوٹا اور اس کے بعض کو بعض سے رگڑا اور یہاں ﴿لَنُحَرِّقَنَّهٗ﴾ کی جگہ لَنَحْرُقَنَّهٗ بھی قراءت پڑھی گئی ہے اور دونوں کے معنی ایک ہیں۔ (ل)

﴿نَنْسِفَنَّ﴾۔ نَسَفَ ہوا کا ایک چیز کو اکھاڑ دینا اور اس کا دور کر دینا ہے۔ ﴿يَنْسِفُهَا رَبِّيْ نَسْفًا﴾ [105] اور ﴿لَنَنْسِفَنَّهٗ فِي الْيَمِّ نَسْفًا﴾ کے معنی ہیں ہم اسے دریا میں اس طرح ڈال دیں گے جس طرح مٹی کا غبار ہوتا ہے۔

بچھڑے کی خاک سے بائبل میں اختلاف:

چونکہ نُحَرِّقَنَّهٗ کے معنی دو طرح ہو سکتے ہیں یعنی جلانا اور پیس ڈالنا۔ ممکن ہے جلانے سے وہ خاکستر ہو گیا ہو اور ممکن ہے بوجہ سونے اور چاندی وغیرہ سے بنا ہونے کے اس کو پیس کر ریت کی طرح کیا گیا ہو۔ دونوں صورتوں میں اسے دریا میں ڈال دیا گیا تا کہ اس کی خاکستر سے بھی کوئی فائدہ نہ اٹھا سکے۔ یہاں بھی قرآن کریم نے بائبل کے اس قصہ کی تردید کی ہے کہ بچھڑے کی خاکستر گھول کر بنی اسرائیل کو پلائی گئی۔ [خروج: 32:20] بعض مفسرین نے یہاں بھی یہ قصہ بڑھا دیا ہے کہ اس بچھڑے میں گوشت اور خون پیدا ہو گیا تھا۔ گویا وہ سچ مچ کا زندہ بچھڑا بن گیا تھا۔ اس لیے اسے جلانے کی ضرورت پیش آئی۔ یہ بھی بالکل بے بنیاد بات ہے۔

يَّوْمَ يُنْفَخُ فِي الصُّوْرِ وَ نَحْشُرُ الْمُجْرِمِيْنَ يَوْمَىِٕذٍ زُرْقًا ﴿۱۰۲﴾

جس دن صور پھونکا جائے گا اور ہم اس دن مجرموں کو اکٹھا کریں گے ان کی آنکھیں نیلی ہوں گی۔ (2099)

يَّتَخَافَتُوْنَ بَيْنَهُمْ اِنْ لَّبِثْتُمْ اِلَّا عَشْرًا ﴿۱۰۳﴾

آپس میں آہستہ آہستہ باتیں کریں گے کہ تم صرف دس (دن) ہی ٹھہرے۔

نَحْنُ اَعْلَمُ بِمَا يَقُوْلُوْنَ اِذْ يَقُوْلُ اَمْثَلُهُمْ طَرِيْقَةً اِنْ لَّبِثْتُمْ اِلَّا يَوْمًا ﴿۱۰۴﴾ ع 5 15 14

ہم خوب جانتے ہیں جو وہ کہیں گے۔ جب ان میں سے اچھے طریق والا کہے گا تم صرف ایک دن ہی ٹھہرے۔ (2100)

2099- زُرْقٌ۔ زُرْقَةٌ سیاہی اور سفیدی کے درمیان ایک رنگ ہے یعنی نیلا اور کہا جاتا ہے کہ [زَرِقَتْ عَيْنُهُ] یعنی اس کی آنکھ نیلی ہے۔ اور یہاں معنی عُمْيًا یعنی اندھے کیے گئے ہیں۔ (غ) مگر ظاہر معنی زیادہ موزوں ہیں۔ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے دریافت کیا گیا کہ ایک آیت میں عمی یعنی حشر میں اندھے ہونے کا ذکر ہے اور یہاں زُرْقًا یعنی نیلی آنکھوں والے۔ تو آپ نے فرمایا کہ قیامت کے مختلف حالات ہیں۔ (ر) اور ہوسکتا ہے کہ اس زُرْقٌ کے لفظ سے بعض ایسی قوموں کی طرف اشارہ ہو جن کی آنکھیں نیلی ہیں اور حشر کے معنی میں ان کے دنیوی حشر کی طرف اشارہ ہو۔

2100- **دس دن اور ایک دن رہنے سے مراد:** پہلی آیت میں ہے کہ وہ ایک دوسرے سے کہیں گے کہ تم دس دن رہے اور یہاں ان میں سے اعلیٰ درجہ کے انسان کا قول بیان کیا ہے کہ تم ایک ہی دن رہے۔ اگر یہ قیامت کا قول ہے تو عشر اور یوم کا الگ الگ بیان کرنا کوئی خاص معنی نہیں رکھتا۔ دونوں قلت میعاد پر دلالت کرتے ہیں۔ اگر کسی قوم کی حیات دنیا کی طرف اشارہ لیا جائے تو عَشْرًا سے مراد دس صدیاں ہوں گی اور افضل انسان کا قول کہ یہ دس صدیاں نہیں ایک یوم ہے۔ اس طرف اشارہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک ایک یوم ہزار سال کی طرح ہے ﴿وَ اِنَّ يَوْمًا عِنْدَ رَبِّكَ كَاَلْفِ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ ۝﴾ [الحج: 47:22] ''اور ایک دن تمہارے رب کے نزدیک ایک ہزار سال کے برابر ہے جو تم گنتے ہو۔'' اور دوسری جگہ امر اسلام کا ایک ہزار سال تک رکا رہنا مذکور ہے۔ ﴿ثُمَّ يَعْرُجُ اِلَيْهِ فِيْ يَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهٗۤ اَلْفَ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ ۝﴾ [السجدة: 5:32] ''پھر وہ اس کی طرح چڑھ جائے گا ایک دن میں جس کا اندازہ ایک ہزار سال ہے جو تم گنتے ہو۔'' اس لیے اگر یہاں مراد ایسی قوم لی جائے جو اسلام کی ترقی میں مانع ہو اور اس کے خلاف زور لگائے تو واقعات کے لحاظ سے اقوام یورپ پر یہ لفظ صادق آتے ہیں کہ ان کی آنکھیں بھی نیلی ہیں اور ایک ہزار سال تک انہوں نے اسلام کی ترقی کو بھی روکا ہے۔

وَ يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْجِبَالِ فَقُلْ يَنْسِفُهَا رَبِّيْ نَسْفًا ﴿۱۰۵﴾

اور تجھ سے پہاڑوں کے متعلق پوچھتے ہیں۔ تو کہہ دے کہ میرا رب انہیں اڑا کر بکھیر دے گا۔ (2101)

فَيَذَرُهَا قَاعًا صَفْصَفًا ﴿۱۰۶﴾

پھر ان کو صاف ہموار میدان کر چھوڑے گا۔

لَّا تَرٰى فِيْهَا عِوَجًا وَّ لَاۤ اَمْتًا ﴿۱۰۷﴾

نہ تو ان میں ٹیڑھا پن دیکھے گا اور نہ اونچ نیچ۔ (2102)

2101- جِبَالِ اور ان کے اڑانے کے متعلق [دیکھو نمبر: 1623]۔ جیسا کہ بارہا کہہ چکا ہوں قرآن کریم نے جو الفاظ قیامت کبریٰ کے متعلق استعمال کیے ہیں وہ ایک رنگ میں قیامت وسطیٰ پر بھی صادق آتے ہیں۔ اور وہ وعید جن کا ذکر [نمبر: 113] میں ہے جس طرح قیامت سے رکھتے ہیں اس دنیا کی زندگی سے بھی تعلق رکھتے ہیں۔ مثلاً اسی سورت میں فرعون کی ہلاکت اور سامری کی سزا کا ذکر ہے اور یہ دونوں باتیں اس دنیا سے تعلق رکھتی ہیں اور یہ ناممکن ہے کہ قرآن شریف ایک قوم کی اس دنیا میں تباہی کو بطور نظیر بیان کر کے پھر مخالفین نبی کریم ﷺ کو صرف عذاب قیامت سے ڈرائے۔ کیونکہ عذاب قیامت سے تو یوں بھی ڈرایا جا سکتا تھا، اس کے لیے کسی قوم کی دنیوی سزا کے ذکر کی کیا ضرورت تھی۔ اور خود الفاظ آیت پر غور کیا جائے تو یہاں سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ قیامت کے آنے یا مردوں کے زندہ ہونے کے لیے جبال یعنی پہاڑوں کا وجود کوئی رکاوٹ نہیں کہ وہ لوگ اس کے متعلق سوال کرتے۔ نہ ایسا سوال کبھی کسی نے فی الواقع کیا کہ پہاڑ موجود ہیں تو قیامت کیونکر آئے گی اور مفسرین نے جو اس دقت کو یوں دور کرنا چاہا ہے کہ یہ سوال بطور استہزا تھا۔ تو یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ اس میں استہزا کیا ہے۔ اور اگر بطور استہزا ہی ذکر تھا تو سمندروں کے متعلق سوال کیوں نہ کیا یا درختوں کے متعلق کیوں نہ کیا۔ اصل بات یہی ہے کہ وہ لوگ جبال کا لفظ عظیم الشان انسانوں پر بولتے تھے۔ اور جب انہیں طرح طرح کے پیرایوں میں بتایا جاتا تھا کہ آخر ان کی بھی وہی حالت ہوگی جو پہلے حق کا مقابلہ کرنے والوں کی ہوئی جیسا کہ [آیت نمبر: 113] میں ذکر ہے تو انہیں یہ امر مستبعد معلوم ہوتا ہے اور وہ کہتے ہیں کہ اتنے اتنے عظیم الشان انسان جو حق کی مخالفت کے درپے ہیں یہ کہاں جائیں گے؟ اور اس کے جواب میں ایسا پیرایہ اختیار فرمایا ہے کہ ان الفاظ میں قیامت کبریٰ اور قیامت وسطیٰ دونوں کا ذکر آ گیا ہے اور ﴿وَ لَوْ اَنَّ قُرْاٰنًا سُيِّرَتْ بِهِ الْجِبَالُ﴾ [الرعد: 31:13] ''اور اگر قرآن ایسا ہوتا جس سے پہاڑ دور کر دیئے جائیں۔'' اس پر شاہد ہے کہ اس قرآن کے مقابل پر کتنے بھی عظیم الشان لوگ آئیں اللہ تعالیٰ ان سب کو دور کر دے گا۔

2102- قَاعَ اور قِيْعَ ہموار زمین کو کہتے ہیں جس کی جمع قِيْعَانٌ ہے۔ (غ) یا فراخ نرم پست زمین جس میں کوئی اونچ نیچ نہ ہو اور نہ اس میں سبزی وغیرہ ہو اور قِيْعَة بعض کے نزدیک واحد اور بعض کے نزدیک قَاعَ کی جمع ہے۔ (ل) ﴿كَسَرَابٍۭ بِقِيْعَةٍ﴾ [النور: 39:24] ''چٹیل میدان میں چمکتی ریت کی طرح ہیں۔''

صَفْصَف ہموار زمین کو کہتے ہیں۔ گویا کہ وہ ایک صف میں ہے۔ (غ)

يَوْمَئِذٍ يَّتَّبِعُوْنَ الدَّاعِيَ لَا عِوَجَ لَهٗ ۚ وَ خَشَعَتِ الْاَصْوَاتُ لِلرَّحْمٰنِ فَلَا تَسْمَعُ اِلَّا هَمْسًا ﴿۱۰۸﴾

اس دن بلانے والے کی پیروی کریں گے جس میں کوئی کجی نہیں۔اور رحمٰن کے سامنے آوازیں پست ہوجائیں گی۔پس تو سوائے ہلکی آواز کے کچھ نہ سنے گا۔ (2103)

اَمْتَ کے اصل معنی قدر یا اندازہ ہیں اور اَمْتَ چھوٹے ٹیلے کو کہتے ہیں اور اس زمین کو بھی جس میں نشیب وفراز ہو اور حدیث میں عیب اور شک کے معنی میں بھی آیا ہے۔(ل)

ان آیات میں هَا کی ضمیر جبال کی طرف ہی ہے۔گویا پہاڑ جو روک کا کام دیتے ہیں وہ نہ رہیں گے۔اور وہی ہموار پست زمین بن جائیں گے۔گویا ایک انقلاب عظیم کا آنا مراد ہے۔وہ انقلاب عظیم اس دنیا میں یوں آیا کہ مقابلہ کرنے والے سب نابود یا مطیع ہوگئے اور سب روکیں جو حق کے پھیلنے میں نظر آتی تھیں دور کردی گئیں اور ان میں عِوَجَ اور اَمْتَ نہ رہنے کا ذکر کیا۔ حالانکہ عِوَج اس ٹیڑھا پن کو کہا جاتا ہے جس کا ادراک فکر اور بصیرت سے ہو۔اگر آنکھ سے دیکھا جانے والا ٹیڑھا پن مراد ہوتا تو عَوَج چاہیے تھا[دیکھو نمبر: 486]۔اور پہلے یہ لوگ ﴿وَ تَبْغُوْنَهَا عِوَجًا﴾[الأعراف: 86:7] ''اور اس میں ٹیڑھا پن چاہتے ہو۔'' کے مصداق تھے۔آخر یہ عوج نہ رہے گا۔اور اسی طرح اَمْتَ کے دوسرے معنی کے لحاظ سے پہلے وہ شک میں تھے وہ بھی جاتا رہے گا اور قیامت میں پہاڑوں کو دور کرکے زمین کے ہموار کردینے سے جو مراد ہے اس کی اصل حقیقت کا علم اللہ تعالیٰ کو ہی ہے کہ اس کی کیا صورت اور کیا غرض ہے۔

2103- دَاعِيَ۔دُعَآءٌ کے لیے[دیکھو نمبر: 208] اور داعی دعا کرنے والا یا پکارنے والا ہے اور داعی ایک لحاظ سے اللہ تعالیٰ کو پکارنے والا ہے۔﴿اُجِيْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ﴾[البقرة: 186:2] ''میں دعا کرنے والے کی دعا کو قبول کرتا ہوں۔'' اور ایک لحاظ سے لوگوں کو اللہ تعالیٰ کی توحید اور اطاعت کی طرف بلانے والا۔اسی لحاظ سے نبی کریم ﷺ کو داعی کہا ہے۔﴿وَّ دَاعِيًا اِلَى اللّٰهِ بِاِذْنِهٖ وَ سِرَاجًا مُّنِيْرًا﴾[الأحزاب: 46:33] ''اور اللہ کی طرف اس کے حکم سے بلانے والا اور روشن کرنے والا سورج۔'' اور قرآن کریم میں آنحضرت ﷺ کو ﴿دَاعِيَ اللّٰهِ﴾ بھی کہا ہے ﴿اَجِيْبُوْا دَاعِيَ اللّٰهِ﴾[الأحقاف: 31:46] ''اللہ کی طرف بلانے والے کو قبول کرو۔'' اور ﴿دَاعِيَ اللّٰهِ﴾ مؤذن کو بھی کہا جاتا ہے۔اس لیے کہ وہ بھی توحید اور طاعت کی طرف بلاتا ہے۔(ل)

هَمْس صوت خفی کو کہتے ہیں۔(غ) یعنی ایسی آواز جو مخفی ہو یا بہت ہلکی ہو۔

داعی کون ہے؟ قرآن کریم میں تو یہ لفظ بالخصوص رسول اللہ ﷺ پر ہی بولا گیا ہے۔اور آپ کا نام خاص طور پر ﴿دَاعِيًا اِلَى اللّٰهِ﴾ یا ﴿دَاعِيَ اللّٰهِ﴾ رکھا گیا ہے۔مگر مفسرین یہاں [دَاعِيْ اِلَى الْمَحْشَرْ] مراد لیتے ہیں۔یعنی اسرافیل۔مگر اسرافیل کی اتباع لوگ کس طرح کریں گے اور پھر ﴿لَا عِوَجَ لَهٗ﴾ سے کیا مراد ہے۔اگر داعی رسول اللہ ﷺ ہوں تو ﴿لَا عِوَجَ لَهٗ﴾ آپ صفت ہے۔﴿اَنْزَلَ عَلٰى عَبْدِهِ الْكِتٰبَ وَ لَمْ يَجْعَلْ لَّهٗ عِوَجًا﴾[الكهف: 1:18] ''جس نے اپنے بندے پر کتاب اتاری اور ان کے لیے کوئی کجی نہ رہنے دی۔'' مگر اسرافیل مراد لے کر یوں تاویل کرنی پڑی کہ وہ ظلم نہیں کرے گا۔اور یا یوں کہ وہ بعض

يَوْمَئِذٍ لَّا تَنْفَعُ الشَّفَاعَةُ اِلَّا مَنْ اَذِنَ لَهُ الرَّحْمٰنُ وَ رَضِيَ لَهٗ قَوْلًا ﴿۱۰۹﴾

اس دن سفارش کسی کو نفع نہ دے گی سوائے اس کے جس کے لیے رحمٰن اجازت دے اور اس کے لیے یہ بات پسند کرے۔ (2104)

يَعْلَمُ مَا بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَ مَا خَلْفَهُمْ وَ لَا يُحِيْطُوْنَ بِهٖ عِلْمًا ﴿۱۱۰﴾

وہ جانتا ہے جو ان کے آگے ہے اور جو ان کے پیچھے ہے اور وہ اپنے علم سے اس کا احاطہ نہیں کر سکتے۔

وَ عَنَتِ الْوُجُوْهُ لِلْحَيِّ الْقَيُّوْمِ ؕ وَ قَدْ خَابَ مَنْ حَمَلَ ظُلْمًا ﴿۱۱۱﴾

اور زندہ قائم (خدا) کے سامنے بڑے بڑے لوگ ذلیل ہو جائیں گے اور وہ نامراد ہوا جس نے ظلم (کا بوجھ) اٹھایا۔ (2105)

لوگوں سے ہٹ کر بعض کی طرف مائل نہ ہوگا۔ یعنی اپنی آواز سب کو سنائے گا اور یہ دونوں تاویلیں بعید ہیں۔ اور بعض مفسرین نے داعی سے مراد یہاں رسول اللہ ﷺ کو ہی لیا ہے۔ (ر) اور رسول اللہ ﷺ کو داعی مراد لے کر یہ امر دنیا میں بھی صحیح ثابت ہوا اور آخرت میں بھی ہوگا کہ وہی لوگ جو پہلے آپ کے حد درجہ کے مخالف تھے وہ سب بڑے بڑے لوگ آپ کے متبع ہوئے اور آوازوں کا رحمان کے سامنے پست ہونا بھی دنیا میں صحیح ہوا کہ سرکشی کی بجائے اللہ تعالیٰ کے حضور فروتنی اختیار کی۔

2104- **شفاعت میں شافع اور مشفوع دونوں کے لیے اذن کی ضرورت اور اس سے مراد:** ان الفاظ کے معنی دونوں طرح پر ہو سکتے ہیں۔ اول یہ کہ شفاعت کرنے والوں کی شفاعت کسی کو نفع نہ دے گی مگر صرف اسی کو جس کی شفاعت کے لیے اللہ تعالیٰ اجازت دے۔ اور جس کی خاطر قول شفاعت کو پسند کرے یا جس کی بات کو پسند کرے یعنی جو ایمان اور طاعت پر قائم ہو۔ اور دوسرے یہ کہ کوئی شفاعت نفع نہ دے گی سوائے اس شخص کی شفاعت کے جسے رحمٰن اجازت دے اور جس کی بات کو پسند کرے۔ اور قرآن شریف سے ثابت ہے کہ شفاعت میں اذن شفاعت کرنے والے کے لیے بھی ہے اور جس کے لیے شفاعت کی جائے اس کے لیے بھی ﴿مَنْ ذَا الَّذِيْ يَشْفَعُ عِنْدَهٗۤ اِلَّا بِاِذْنِهٖ﴾ [البقرة: 255:2] ''وہ کون ہے جو اس کے پاس سوائے اس کی اجازت کے سفارش کرے۔'' ﴿لَا يَشْفَعُوْنَ ۙ اِلَّا لِمَنِ ارْتَضٰى﴾ [الأنبیآء: 28:21] ''وہ شفاعت نہیں کرتے مگر اسی کے لیے جسے وہ پسند کرے۔'' اور اذن سے مراد یہ ہے کہ شفاعت کرنے والے بھی خاص لوگ ہوں گے، جو قرب کے مرتبہ پر ہیں اور مشفوع بھی خاص لوگ ہوں گے جنہوں نے کوشش کی مگر ایسی وجوہات سے جو ان کی طاقت سے باہر ہیں کمال کے کرنے سے رہ گئے۔

2105- عَنَتِ کے لیے [دیکھو نمبر: 283] اور وُجُوْهُ وجہ کی جمع ہے جس کے لیے [دیکھو نمبر: 144 و 667] اور مراد مونہوں سے خود وہ لوگ

وَ مَنْ يَّعْمَلْ مِنَ الصّٰلِحٰتِ وَ هُوَ مُؤْمِنٌ فَلَا يَخٰفُ ظُلْمًا وَّ لَا هَضْمًا ﴿۱۱۲﴾

اور جو اچھے عمل کرے اور وہ مومن ہے تو اسے نہ ظلم کا خوف ہوگا اور نہ حق تلفی کا۔ (2106)

وَ كَذٰلِكَ اَنْزَلْنٰهُ قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا وَّ صَرَّفْنَا فِيْهِ مِنَ الْوَعِيْدِ لَعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ اَوْ يُحْدِثُ لَهُمْ ذِكْرًا ﴿۱۱۳﴾

اور اسی طرح ہم نے اسے قرآن عربی اتارا اور اس میں طرح طرح سے ڈرانے کی باتوں کو بیان کیا ہے۔ تاکہ وہ (بری راہوں سے) بچیں بلکہ یہ ان کے لیے بڑائی پیدا کرے گا۔ (2107)

بھی ہو سکتے ہیں اور اشراف الناس پر بھی یہ لفظ بولا جاتا ہے۔ (ر) پس مطلب یہ ہے کہ بڑے بڑے لوگ حی قیوم خدا کے سامنے ذلیل ہو جائیں گے۔ اور ﴿اَلْحَیُّ الْقَیُّوْمُ﴾ کا لفظ لانے میں یہ اشارہ ہے کہ وہ ان کو حقیقی زندگی عطا فرمائے گا۔ یعنی وہ اسلام میں داخل ہو جائیں گے۔ اور عرب کے کل کے کل بڑے بڑے لوگ آخر مسلمان ہوئے۔

2106- هَضْمَ کے معنی ہیں اس چیز کا توڑنا جس میں نرمی ہو۔ اور ﴿طَلْعُهَا هَضِيْمٌ﴾ [الشعرآء: 148:26] ''جن کا گابھا ملائم ہے۔'' میں مراد ہے کہ اس کا بعض بعض میں داخل ہے۔ گویا کہ اسے توڑا گیا ہے۔ (غ) اور اسی سے کھانے کا ہضم ہونا ہے۔ اور [هَضْمَهٗ حَقَّه] کے معنی ہیں اس کا حق اسے ناقص کر کے دیا اور هَضِيْمٌ اسے کہتے ہیں جو اپنے گابھ کے اندر ہو اور خوشگوار اور تازہ بھی اس کے معنی ہیں۔ (ل)

مومنوں کے حق میں ظلم و ہضم کی نفی:

ایسے مومن کو جو اعمال صالحہ کرے ظلم اور ہضم کا خوف نہیں ہوگا۔ ظلم تو یہ ہے کہ ایک شخص نے ایک کام نہیں کیا اور اسے سزا دی جائے یا جتنا برا کام کیا ہے اس سے بڑھ کر سزا دی جائے اور ہضم یہ ہے کہ جو اس نے اچھا کام کیا ہے اس کے بارہ میں اس کی حق تلفی ہو۔ یعنی اس کے ذمہ خواہ مخواہ کوئی بدی نہ لگائی جائے۔ نہ اس کے نیک کام بلا اجر رہیں گے۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ برائی کرنے والوں کے حق میں ظلم اور ہضم ہوگا۔ مگر چونکہ وہ سزا پائیں گے اور ان کے نیک عمل ایسے نہ ہوں گے جو ان کو سزا سے بچا سکیں گے۔ اس لیے یہ ترکیب اختیار کی ہے۔ اور اس سے پہلی آیت میں ہے ﴿مَنْ حَمَلَ ظُلْمًا﴾۔ تو گویا ظلم اللہ تعالیٰ انسان پر نہیں کرتا بلکہ برا انسان خود اپنے نفس پر ظلم کرتا ہے۔ پس جس نے خود اپنے نفس پر ظلم نہیں کیا اسے کسی ظلم کا خوف نہیں اور جس نے اپنے نفس کے حقوق کو تلف نہیں کیا اس کی حق تلفی کوئی نہ ہوگی۔ اس لیے اس کے معنی یوں بھی کیے گئے ہیں کہ وہ ظلم اور ہضم کی سزا سے بے خوف ہوگا۔

2107- يُحْدِثُ۔ حَدُوْثٌ کے لیے [دیکھو نمبر: 1516د] اور اُحْدِثَ وجود میں لانا ہے۔ ﴿اُحْدِثَ لَكَ مِنْهُ ذِكْرًا﴾ [الکھف: 70:18] ''میں خود تجھ سے اس کا ذکر کروں۔'' ﴿لَعَلَّ اللّٰهَ يُحْدِثُ بَعْدَ ذٰلِكَ اَمْرًا ۝﴾ [الطلاق: 1:65] ''شاید اللہ اس کے بعد کوئی

فَتَعٰلَى اللّٰهُ الْمَلِكُ الْحَقُّ ۚ وَ لَا تَعْجَلْ بِالْقُرْاٰنِ مِنْ قَبْلِ اَنْ يُّقْضٰۤى اِلَيْكَ وَحْيُهٗ ۫ وَ قُلْ رَّبِّ زِدْنِيْ عِلْمًا ﴿۱۱۴﴾

سو اللہ کی بلند شان ہے جو سچا بادشاہ ہے اور تو قرآن کے لینے میں جلدی نہ کر۔ قبل اس کے کہ اس کی وحی تیری طرف پوری کی جائے اور کہہ میرے رب مجھے علم میں بڑھا۔ (2108)

وَ لَقَدْ عَهِدْنَاۤ اِلٰۤى اٰدَمَ مِنْ قَبْلُ فَنَسِيَ وَ لَمْ نَجِدْ لَهٗ عَزْمًا ﴿۱۱۵﴾ ع 6 11 15

اور یقیناً ہم نے آدم کو پہلے حکم دیا تھا مگر وہ بھول گیا اور ہم نے اس کا عزم نہ پایا۔ (2109)

بات پیدا کردے۔''

اور ذکر سے مراد یہاں شرف وعظمت ہے۔[دیکھو نمبر: 191] اور ﴿قُرْءٰنًا عَرَبِيًّا﴾ سے مراد ہے کھول کر بیان کرنے والا[دیکھو نمبر: 1516] اور اَوْ بمعنی بَلْ ہے یعنی نہ صرف وہ بدیوں سے بچ جائیں گے بلکہ یہ قرآن ان کے لیے ایک عظمت اور شرف کا مقام پیدا کردے گا۔

2108- **الْحَقُّ** کے لیے[دیکھو نمبر: 65]۔قرآن کے متعلق جلدی کرنے سے یہ مراد لی گئی ہے کہ جیسا حدیث میں ذکر ہے کہ پہلے نبی کریم ﷺ اس خوف سے کہ کچھ رہ نہ جائے ملک سے وحی لینے میں جلدی کیا کرتے تھے۔مگر یہاں وعید کا ذکر ہے اس لیے یہ مراد نہیں ہوسکتی۔اصل یہ ہے کہ ابتدائی سورتوں میں وعد اور وعید کا ذکر زیادہ تر مجاز اور استعارہ کے رنگ میں ہے۔جیسا کہ اوپر بھی وعید کا ذکر اسی رنگ میں ہوا اور رسول اللہ ﷺ یہ چاہتے تھے کہ ان کو ان کی بدکرداریوں اور مخالفت حق کا انجام صاف لفظوں میں جلد بتادیا جائے۔اس لیے فرمایا کہ اس معاملہ میں جلدی نہ کرو۔ بلکہ کہو ﴿رَّبِّ زِدْنِيْ عِلْمًا﴾۔یعنی اور زیادہ مجھے علم دیا جائے۔اور آنحضرت ﷺ کی دعا مذکور ہے [اَللّٰهُمَّ انْفَعْنِي بِمَا عَلَّمْتَنِي وَعَلِّمْنِي مَا يَنْفَعُنِي وَزِدْنِي عِلْمًا] (جامع الترمذی، کتاب الدعوات، باب146، حدیث: 3948) اے اللہ مجھے اس سے نفع پہنچا جو تو نے مجھے علم دیا ہے اور مجھے وہ علم دے جو نفع دے اور میرا علم بڑھا۔

2109- **آدم کی عصمت: عَزْمَ** کے لیے[دیکھو نمبر: 290]۔کسی امر کے کر گزرنے کے لیے دل کو پختہ کرلینا اور یہاں نسیان کا قرینہ بتاتا ہے کہ جو امر آدم سے سرزد ہوا وہ نسیان کا نتیجہ تھا۔عزم یعنی عمد اور ارادہ سے نہ تھا۔ بالفاظ دیگر ذنب پر عزم نہ تھا۔ یہ معنی ابن زید وغیرہ سے مروی ہیں۔(د) اور راغب نے یوں معنی کیے ہیں کہ یہاں مراد اس امر کی محافظت ہے، یعنی جو کچھ حکم دیا گیا تھا اس کی حفاظت نہ کرسکے اور قیام پر ہم نے ان میں عزم نہ پایا۔(غ) دونوں صورتوں میں نسیان کا لفظ آدم کی عصمت پر بین دلیل ہے۔

وَ اِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ ؕ اَبٰى ﴿۱۱۶﴾

اور جب ہم نے فرشتوں سے کہا کہ آدم کی فرمانبرداری کرو، تو انہوں نے فرمانبرداری کی۔ مگر ابلیس نے (نہ کی) اس کا انکار کیا۔

فَقُلْنَا يٰٓاٰدَمُ اِنَّ هٰذَا عَدُوٌّ لَّكَ وَ لِزَوْجِكَ فَلَا يُخْرِجَنَّكُمَا مِنَ الْجَنَّةِ فَتَشْقٰى ﴿۱۱۷﴾

تو ہم نے کہا اے آدم! یہ تیرا اور تیرے جوڑے کا دشمن ہے سو یہ تم دونوں کو جنت سے نہ نکلوا دے۔ پس تو تکلیف میں پڑے۔ (2110)

اِنَّ لَكَ اَلَّا تَجُوْعَ فِيْهَا وَ لَا تَعْرٰى ﴿۱۱۸﴾ۙ

تیرے لیے یہ ہے کہ تو اس میں نہ بھوکا رہے اور نہ ننگا رہے۔

وَ اَنَّكَ لَا تَظْمَؤُا فِيْهَا وَ لَا تَضْحٰى ﴿۱۱۹﴾

اور یہ کہ تو اس میں نہ پیاسا رہے اور نہ دھوپ میں رہے۔ (2111)

وحی سے فطری کمزوری کا علاج:

یہاں چونکہ اوپر ایک معاملہ میں جلدی کرنے سے روکا تھا تو اس لحاظ سے حضرت آدم علیہ السلام کا ذکر کیا کہ انہوں نے بھی جلد ایک نتیجہ کو حاصل کرنے کے خیال سے غلطی کھائی۔ اور یا اس لحاظ سے ذکر ہے کہ انسان وحی الٰہی کے بغیر خود بخود اپنی فطری طاقت سے بدی کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ چنانچہ حضرت آدم علیہ السلام بھی جب فطری عہد کو قائم نہ رکھ سکے تو اس کمزوری کا علاج وحی الٰہی سے کیا گیا۔

2110- تَشْقٰی۔ شَقَا اور شِقَاوَةٌ کے لیے [دیکھو نمبر: 1504]۔ کسی قسم کی خیر سے محرومی اور شَقَاءٌ شدت اور عسرت (سختی اور تنگی) کو بھی کہتے ہیں۔ (ل) جنت سے نکلنے کا نتیجہ شقاوت ہے۔ پس یہ شقاوت شدت و عسرت ہی ہے۔

2111- تَجُوْعَ۔ جُوع وہ تکلیف ہے جو انسان کو معدہ کے کھانے سے خالی ہونے کی وجہ سے پہنچتی ہے۔ (غ) اور عِلْمَ کے معنی اِسْتِجَاعَةٌ یعنی طلب جوع یہ ہے کہ اس سے انسان سیر نہ ہو اور [جَاعَ اِلٰی لِقَآئِهٖ] کے معنی ہیں اس کی ملاقات کی خواہش کی۔ (ل) یعنی معانی میں بھی اس کا استعمال ہے۔

﴿تَعْرٰی﴾۔ عَرِی کے معنی ہیں ننگا ہوا اور [عَرُوٌّ مِنَ الذَّنبِ] کے معنی ہیں ذنب سے عاری۔ (غ) اور حدیث میں آنحضرت ﷺ کی صفت میں ہے [أَنَا النَّذِيرُ الْعُرْيَانُ] (صحيح البخاری: 6482) یعنی کھول کر بیان کرنے والا نذیر۔ (ل)

فَوَسۡوَسَ اِلَیۡهِ الشَّیۡطٰنُ قَالَ یٰۤاٰدَمُ هَلۡ اَدُلُّكَ عَلٰی شَجَرَۃِ الۡخُلۡدِ وَ مُلۡكٍ لَّا یَبۡلٰی ﴿۱۲۰﴾

پس شیطان نے اس کو وسوسہ ڈالا ۔کہا، اے آدم کیا میں تجھے ہمیشگی کے درخت کا پتہ دوں اور ایسی بادشاہت کا جو پرانی نہ ہو؟(2112)

فَاَكَلَا مِنۡهَا فَبَدَتۡ لَهُمَا سَوۡاٰتُهُمَا وَ طَفِقَا یَخۡصِفٰنِ عَلَیۡهِمَا مِنۡ وَّرَقِ الۡجَنَّۃِ ۫ وَ عَصٰۤی اٰدَمُ رَبَّهٗ فَغَوٰی ﴿۱۲۱﴾

سو دونوں نے اس سے کھایا تو ان کے عیب ان کے لیے ظاہر ہو گئے اور وہ جنت کے پتوں سے اپنے آپ کو ڈھانکنے لگے اور آدم نے اپنے رب کی نافرمانی کی پس ناکام ہوا۔(2113)

﴿تَظۡمَؤُا﴾۔ ظَمَاء کے معنی پیاس ہیں۔اور ظَمۡاٰن پیاسا ﴿یَحۡسَبُهُ الظَّمۡاٰنُ مَآءً﴾[النور: 39:24] ''جسے پیاسا پانی سمجھتا ہے۔''

﴿تَضۡحٰی﴾۔ ضَحَی (یَضۡحی)[تَعَرَّضَ لِلشَّمۡسِ] یعنی اپنے آپ کو سورج کے سامنے رکھا اور ﴿لَا تَضۡحٰی﴾ کے معنی ہوئے کہ سورج کی گرمی سے محفوظ کر لیتا ہے۔(غ)

ان دو آیات میں اسباب راحت کو جمع کر دیا ہے۔ بھوک کی تکلیف سے بچا رہے، ننگا نہ ہو، پیاس اور دھوپ سے محفوظ رہے، کھانا پینا، پہننا، مکان یہی انسان کی ضرورت کی چار چیزیں ہیں اور ان کا مہیا ہو جانا گویا انسان کی آسائش کے اسباب کا اجتماع ہے۔ اور دوسری جگہ اسی خیال کو ان الفاظ میں ظاہر فرمایا ہے ﴿وَ كُلَا مِنۡهَا رَغَدًا حَیۡثُ شِئۡتُمَا﴾[البقرۃ: 35:2] ''اور اس میں سے بافراغت کھاؤ جہاں سے چاہو۔'' گویا دونوں جگہ ہر قسم کی فراغت کا ہی ذکر ہے۔مگر کیا اس سے مراد جسمانی طور پر فارغ البال ہونا ہے۔اور انسان کی جنت یہی ہے کہ اسے کھانے پینے کو بہت ملے؟ تو پھر اس جنت کو بہت سے بدکار بھی اسی دنیا میں حاصل کر لیتے ہیں۔[آیت: 124] اس کو حل کرتی ہے۔ جو شخص میرے ذکر سے منہ پھیرتا ہے اس کے لیے تنگی کی روزی ہے۔ظاہر ہے کہ اس تنگی کی معیشت سے یہ مراد نہیں کہ اسے جسم کو قائم رکھنے کے لیے سامان معیشت کم ملے گا یا نہ ملے گا۔ بلکہ وہ ایسی تنگی ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ قیامت کے دن وہ اندھا اٹھایا جائے گا۔اسی مضمون پر[دیکھو نمبر: 1061 و 1064]۔پس گو لفظ بھوک اور پیاس وغیرہ کے استعمال ہوئے ہیں مگر مراد یہی ہے کہ روحانی طور پر تنگی نہیں بلکہ آسائش حاصل ہوتی ہے۔اس لیے کہ وہ ان کے پیچھے نہیں پڑتا اور کھانے پینے کو اللہ تعالیٰ دے ہی دیتا ہے۔تفصیل کے لیے[دیکھو نمبر: 2116] نیز[دیکھو نمبر: 54]۔

2112- دوسری جگہ ہے ﴿اِلَّاۤ اَنۡ تَكُوۡنَا مَلَكَیۡنِ اَوۡ تَكُوۡنَا مِنَ الۡخٰلِدِیۡنَ ﴿۲۰﴾﴾[الأعراف: 20:7] ''مگر اس لیے کہ تم فرشتے نہ بن جاؤ یا ہمیشہ رہنے والوں میں سے نہ ہو جاؤ۔'' پس ﴿شَجَرَۃِ الۡخُلۡدِ﴾ سے مراد ہمیشہ کی زندگی ہے۔[دیکھو نمبر: 1062]۔

2113- غَوٰی کے معنی یہاں جَهِل کیے گئے ہیں یعنی جاہل ہوا یا خَابَ یعنی ناکام رہا۔ یا[فَسَدَ عَیۡشُهٗ] یعنی اس کی زندگی میں فساد

ثُمَّ اجْتَبٰهُ رَبُّهٗ فَتَابَ عَلَيْهِ وَهَدٰى ﴿۱۲۲﴾

پھر اس کے رب نے اسے چن لیا۔ پس اس پر (رحمت سے) متوجہ ہوا اور راستہ دکھایا۔ (2114)

قَالَ اهْبِطَا مِنْهَا جَمِيْعًا ۚ بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ ۚ فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّيْ هُدًى ۙ فَمَنِ اتَّبَعَ هُدَايَ فَلَا يَضِلُّ وَلَا يَشْقٰى ﴿۱۲۳﴾

فرمایا تم سب اس سے نکل جاؤ، تم ایک دوسرے کے دشمن ہو۔ سو اگر میری طرف سے تمہارے پاس ہدایت آئے، سو جو کوئی میری ہدایت کی پیروی کرے گا وہ نہ گمراہ ہوگا اور نہ تکلیف میں پڑے گا۔ (2115)

وَمَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِيْ فَاِنَّ لَهٗ مَعِيْشَةً ضَنْكًا وَّنَحْشُرُهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اَعْمٰى ﴿۱۲۴﴾

اور جو کوئی میرے ذکر سے منہ پھیرے گا تو اس کے لیے تنگی کی زندگی ہوگی اور ہم اسے قیامت کے دن اندھا اٹھائیں گے۔ (2116)

واقع ہوا۔ ان الفاظ کی تفسیر [نمبر: 1064] میں گزر چکی ہے۔

2114- اجْتَبٰی کے لفظ میں بتایا کہ اللہ تعالیٰ نے اس میں بھلائی کی باتوں کو جمع کیا تھا [دیکھو نمبر: 575] اور هَدٰی میں اس ہدایت کی طرف اشارہ کیا جو بذریعہ وحی الٰہی ملتی ہے ﴿فَتَلَقّٰۤى اٰدَمُ مِنْ رَّبِّهٖ كَلِمٰتٍ فَتَابَ عَلَيْهِ﴾ [البقرة: 37:2] ''پھر آدم نے اپنے رب سے (کچھ) باتیں سیکھ لیں۔ پس اس نے اس پر (رحمت سے) توجہ کی۔'' یعنی اللہ تعالیٰ نے اپنی وحی کے ذریعہ سے ان غلطیوں سے بچایا جن کے دفع کرنے پر فطرت انسانی اکیلی قادر نہیں۔

2115- هَبِط کے لیے اور ﴿بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ﴾ کے لیے [دیکھو نمبر: 56]۔ ذکر تو دونوں کا ہے مگر کل نسل انسانی سے خطاب کر لیا ہے۔ اس لیے کہ یہ دونوں ساری نسل کے لیے بمنزلہ اصل کے ہیں۔ اور بتایا ہے کہ جو قانون ان دو پر حاوی ہے وہی سب نسل انسانی پر حاوی ہوگا۔

2116- ﴿ضَنْكًا﴾ کے معنی ضَیّق یعنی تنگ ہیں۔

تنگی سے کیا مراد ہے؟ بعض مفسرین نے اسے عذاب قبر قرار دیا ہے، بعض نے عذاب جہنم۔ مگر ظاہر ہے کہ یہ اس دنیا کی زندگی سے تعلق رکھتا ہے۔ کیونکہ اس کے بعد آتا ہے ﴿وَنَحْشُرُهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اَعْمٰى﴾۔ پس لازماً وہ کوئی اور بات ہے۔ اب یہاں اللہ تعالیٰ سے اعراض کا ذکر ہے اور دوسری جگہ فرمایا ﴿اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَىِٕنُّ الْقُلُوْبُ﴾ [الرعد: 28:13] ''سن رکھو اللہ کے ذکر سے ہی دلوں کو اطمینان ملتا ہے۔'' یعنی اطمینانِ قلب انسان کو اس دنیا میں صرف ذکر اللہ سے ملتا ہے اور جو ذکر اللہ سے اعراض

قَالَ رَبِّ لِمَ حَشَرۡتَنِیۡۤ اَعۡمٰی وَ قَدۡ کُنۡتُ بَصِیۡرًا ﴿۱۲۵﴾

کہے گا اے میرے رب! تو نے مجھے اندھا کیوں اٹھایا اور میں دیکھنے والا تھا۔ (2117)

کرے گا ظاہر ہے کہ وہ اطمینان قلب کو کبھی حاصل نہیں کرسکتا۔ اور فی الحقیقت زندگی میں وسعت اور تنگی کثرت وقلت سامان پر منحصر نہیں بلکہ حالت قلب پر اس کا انحصار ہے۔ جسے اطمینان قلب میسر آ جاتا ہے تو اسے تھوڑے سامان بھی بہت ہیں۔ اور جسے اطمینانِ قلب نہیں ملتا اس کے لیے ساری دنیا بھی ہو تو بھی اور زیادہ جلن کا موجب ہی ہوتی ہے۔ اور سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے ﴿مَعِیۡشَةً ضَنۡکًا﴾ کے معنی شقاء مروی ہیں۔ (ج) یعنی خیرات اور نیکیوں سے محرومی۔ اور بعض کے نزدیک رزق حرام اور کسب خبیث مراد ہے۔ کیونکہ وہ باوجود فراخی کے تنگی ہے۔ (ج) پس دنیادار کی زندگی فی الواقع ایک تنگی کی زندگی ہے اور وہ خود اس تنگی کو محسوس کرتا ہے۔ اور ایک لحاظ سے یہ بھی تنگی کی زندگی ہے۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو مختلف قسم کے قویٰ دیئے ہیں۔ اور ان سب قویٰ سے کام لینے سے ہی انسان کی زندگی میں حقیقی کشائش پیدا ہوتی ہے۔ لیکن جو لوگ اخلاقی اور روحانی پہلو کی طرف سے آنکھیں بند کر کے صرف دنیا کی زندگی پر ہی گرے رہتے ہیں وہ خود اپنی زندگی کو ایک تنگ دائرہ میں محدود کر دیتے ہیں۔

حشر میں اندھا ہونے سے مراد:

اور ان کی زندگی کے حقیقی پہلو سے آنکھیں بند رکھنا ہی اس بات کا موجب ہے کہ وہ قیامت کے دن اندھے اٹھیں گے، کیونکہ وہ یہاں اندھے رہے ﴿وَ مَنۡ کَانَ فِیۡ هٰذِهٖۤ اَعۡمٰی فَهُوَ فِی الۡاٰخِرَةِ اَعۡمٰی﴾ [بنی إسرائیل: 72:17] ''اور جو کوئی اس (دنیا) میں اندھا رہا تو وہ آخرت میں بھی اندھا ہوگا۔'' اس سے بھی معلوم ہوا کہ انسان کو جنت یا سکون یا اطمینان قلب اللہ تعالیٰ کی طرف جھکنے سے ملتا ہے اور وہ جنت جو انسان اس دنیا میں حاصل کرسکتا ہے اور جس میں پہلے آدم کو رکھا گیا تھا، یہی اطمینانِ قلب کی جنت تھی۔ [دیکھو نمبر: 54]

اَعۡمٰی یا اندھا اٹھانے سے کیا مراد ہے؟ دوسری جگہ ہے ﴿وَ نَحۡشُرُهُمۡ یَوۡمَ الۡقِیٰمَةِ عَلٰی وُجُوۡهِهِمۡ عُمۡیًا وَّ بُکۡمًا وَّ صُمًّا﴾ [بنی إسرائیل: 97:17] ''اور ہم انہیں قیامت کے دن تک ان کے مونہوں کے بل (گرتے ہوئے) اکٹھا کریں گے اندھے اور گونگے اور بہرے۔'' یعنی اندھے، بہرے، گونگے اٹھائے جائیں گے۔ عام طور پر یہ سمجھا گیا ہے کہ ان کی آنکھیں نہیں ہوں گی مگر وہ آگ کو دیکھیں گے ﴿وَ رَاَ الۡمُجۡرِمُوۡنَ النَّارَ﴾ [الکهف: 53:18] اور اپنا نامہ اعمال بھی پڑھیں گے ﴿اِقۡرَاۡ کِتٰبَکَ﴾ [بنی إسرائیل: 14:17]۔ پس یہ ایسا اندھا پن ہے کہ سزا کے سامانوں کو دیکھیں گے اور نعماء کو نہ دیکھ سکیں گے۔ اور ان نعماء کو وہی دیکھ سکتا ہے جو خود اپنے اندر ایسی آنکھیں پیدا کرتا ہے جن سے وہ نعماء دیکھی جاسکتی ہیں۔ ایک راستباز انسان جس راحت اور جنت کو اس دنیا کی زندگی میں محسوس کرتا ہے اسے ایک طالب دنیا نہیں دیکھ سکتا۔ پس نعمائے جنت کو کس طرح دیکھے۔ اور [آیت: 126] میں بتا دیا کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ترک کیا جانا یا لقاء اللہ سے محرومی یہی نابینائی ہے۔

2117- اس کا یہ کہنا کہ میں بصیر تھا تو مراد اس دنیوی معاملات میں بصیرت ہے۔ اگلی آیت میں جواب سے یہ ظاہر ہے۔ جہاں فرمایا کہ

قَالَ كَذٰلِكَ اَتَتْكَ اٰيٰتُنَا فَنَسِيْتَهَا ۚ وَ كَذٰلِكَ الْيَوْمَ تُنْسٰى ﴿۱۲۶﴾

کہا، ایسا ہی تیرے پاس میری آیات آئیں تو تُو نے ان کی پروانہ کی۔ اسی طرح آج تیری بھی پروانہ کی جائے گی۔

وَ كَذٰلِكَ نَجْزِيْ مَنْ اَسْرَفَ وَ لَمْ يُؤْمِنْۢ بِاٰيٰتِ رَبِّهٖ ؕ وَ لَعَذَابُ الْاٰخِرَةِ اَشَدُّ وَ اَبْقٰى ﴿۱۲۷﴾

اور اسی طرح ہم اسے بدلہ دیتے ہیں جو حد سے بڑھے اور اپنے رب کی باتوں پر ایمان نہ لائے اور آخرت کا عذاب یقیناً زیادہ سخت اور زیادہ دیر پا ہے۔ (2118)

اَفَلَمْ يَهْدِ لَهُمْ كَمْ اَهْلَكْنَا قَبْلَهُمْ مِّنَ الْقُرُوْنِ يَمْشُوْنَ فِيْ مَسٰكِنِهِمْ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّاُولِي النُّهٰى ﴿۱۲۸﴾ ع 7 13 16

تو کیا ان کو اس سے ہدایت نہیں ہوئی کہ ان سے پہلے ہم نے کتنی نسلوں کو ہلاک کیا، جن کے رہنے کی جگہوں میں یہ چلتے پھرتے ہیں، اس میں عقل والوں کے لیے نشان ہیں۔ (2119)

وَ لَوْ لَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ رَّبِّكَ لَكَانَ لِزَامًا وَّ اَجَلٌ مُّسَمًّى ﴿۱۲۹﴾

اور اگر تیرے رب کی طرف سے ایک بات پہلے نہ ہو چکی ہوتی، اور ایک وقت مقرر (نہ ہوتا) تو یقیناً (عذاب) آ ہی لگا ہوتا۔ (2120)

ہماری آیات آئیں تو اس نے پروانہ کی یعنی ان کی طرف سے آنکھیں بند کر لیں۔ اس لیے دنیا کے معاملات میں بصیرت وہاں فائدہ نہیں دے سکتی اور جو آنکھ یہاں بند رہی وہ وہاں بھی بند ہوگی۔

2118- اَسْرَاف کسی فعل میں حد سے گزر جانے کا نام ہے۔ اور یہاں شہوات میں انہماک مراد ہے اور عذاب آخرت کو جو ﴿اَشَدُّ وَ اَبْقٰى﴾ کہا تو مراد ہے کہ دنیا کے عذاب سے وہ زیادہ سخت اور دیر پا ہے۔ اور دنیا کا عذاب وہ ہے جس کا ذکر ﴿فَاِنَّ لَهٗ مَعِيْشَةً ضَنْكًا﴾ میں ہے۔ گویا وہی تنگی سخت تر صورت میں ظاہر ہو جائے گی۔

2119- يَهْدِ۔ هَدَايَة کے معنی کے لیے۔ اور هَدٰى بمعنی بَيَّنَ بھی آتا ہے جیسے محمد بن کعب کی حدیث میں [فَما هَدَى مِمَّا رَجَعَ] جس کے معنی ہیں کہ اس نے جو جواب دیا اس میں نہ بات کو واضح کیا نہ کوئی دلیل دی۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ لغت اہل غور میں [هدَيْتُ لَكَ] کے معنی ہیں [بَيَّنْتُ لَكَ] یعنی بات کو کھول کر بیان کیا اور یہی معنی یہاں ہیں۔ (ل)

2120- ترکیب میں یوں ہے ﴿وَ لَوْ لَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ رَّبِّكَ لَكَانَ لِزَامًا﴾ مگر ﴿لَكَانَ لِزَامًا﴾ کو مقدم اس لیے کیا کہ فی الحقیقت یہ

فَاصْبِرْ عَلٰى مَا يَقُوْلُوْنَ وَ سَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ قَبْلَ طُلُوْعِ الشَّمْسِ وَ قَبْلَ غُرُوْبِهَا ۚ وَ مِنْ اٰنَآئِ الَّيْلِ فَسَبِّحْ وَ اَطْرَافَ النَّهَارِ لَعَلَّكَ تَرْضٰى ﴿۱۳۰﴾

سو اس پر صبر کر جو وہ کہتے ہیں اور سورج کے نکلنے سے پہلے اور اس کے ڈوبنے سے پہلے اپنے رب کی حمد کے ساتھ تسبیح کر اور رات کے وقتوں میں بھی تسبیح کر اور دن کی طرفوں میں بھی، تا کہ تو راضی ہو جائے۔ (2121)

وَ لَا تَمُدَّنَّ عَيْنَيْكَ اِلٰى مَا مَتَّعْنَا بِهٖۤ اَزْوَاجًا مِّنْهُمْ زَهْرَةَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۙ لِنَفْتِنَهُمْ فِيْهِ ؕ وَ رِزْقُ رَبِّكَ خَيْرٌ وَّ اَبْقٰى ﴿۱۳۱﴾

اور اپنی نگاہیں اس کے پیچھے لمبی نہ کر جو ہم نے ان میں سے قسم قسم کے لوگوں کو دنیا کی زندگی کی آرائش کے لیے سامان دیا ہے۔ تا کہ ہم ان کو اس کے ذریعہ سے آزمائیں اور تیرے رب کا رزق بہتر اور زیادہ دیرپا ہے۔ (2122)

مستحق تو اسی بات کے تھے کہ عذاب فوراً ان کے لازم حال ہو جاتا۔ اور کلمۃ جو پہلے سے اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہو چکا ہے وہ اس کی رحمت کی سبقت غضب پر ہے جس کی وجہ سے وہ جلد گرفت نہیں کرتا۔ اور ﴿اَجَلٌ مُّسَمًّى﴾ یہ تھی کی کہ مخالف اپنی تمام تدابیر اکو کمال تک پہنچا کر آخر اسلام کو تلوار سے نیست و نابود کرنے کے لیے نکل پڑیں ﴿سَيُهْزَمُ الْجَمْعُ وَ يُوَلُّوْنَ الدُّبُرَ﴾ [القمر: 45:54] ''(یہ) جمعیت شکست کھائے گی اور پیٹھ پھیر دیں گے۔'' اس لیے ﴿اَجَلٌ مُّسَمًّى﴾ سے مراد بعض نے یوم بدر لیا ہے اور اس پر یہ اعتراض درست نہیں کہ یہاں ذکر عذاب استیصال کا ہے اور بدر میں استیصال نہیں ہوا۔ اس لیے کہ وہ ابتدا ہے اور فتح مکہ کے ساتھ وہ عذاب استیصال کمال کو پہنچ گیا۔

2121- **اوقات نماز:** مصائب پر صبر کے ساتھ ہمیشہ نماز کا ذکر ہوتا ہے۔ کیونکہ اس میں رجوع الی اللہ ہے ﴿وَ اسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَ الصَّلٰوةِ﴾ [البقرۃ: 45:2] ''اور صبر اور نماز کے ساتھ مدد مانگتے رہو۔'' اور یہاں بھی پانچ اوقات نماز کا ذکر ہے۔ صبح اور عصر کا ذکر تو صراحت سے ہے ﴿قَبْلَ طُلُوْعِ الشَّمْسِ وَ قَبْلَ غُرُوْبِهَا﴾ اور باقی نمازوں کا ذکر ﴿اٰنَآئِ الَّيْلِ﴾، ﴿وَ اَطْرَافَ النَّهَارِ﴾ میں ہے۔ دن کی طرفیں یوں بھی ہو سکتی ہیں کہ طلوع آفتاب سے پہلے اور زوال آفتاب کے بعد اور یہی مراد ﴿طَرَفَيِ النَّهَارِ﴾ [ھود: 114:11] ''دن کے دونوں طرفوں میں۔'' میں ہے اور یوں بھی ہو سکتا ہے کہ زوال آفتاب کے بعد اور غروب آفتاب کے بعد اور یہی مراد یہاں ہے، یعنی ظہر اور مغرب۔ اور ترضی میں یہ اشارہ ہے کہ کامیابی کو حاصل کرے۔ کیونکہ کامیابی پر ہی انسان راضی ہوتا ہے۔

2122- زَهْرَةَ سبزی کی کلی کو کہتے ہیں اور بعض نے اسے سفید سے مخصوص کیا ہے اور ﴿زَهْرَةَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا﴾ اس کی تروتازگی اور حسن اور خوشنمائی کو کہا جاتا ہے۔ اور زُهْرَةٌ حسن اور سفیدی کو کہا جاتا ہے۔ اور [رَجُلٌ اَزْهَر] اس مرد کو کہا جاتا ہے جس کا رنگ سفید ہو

وَ اۡمُرۡ اَهۡلَكَ بِالصَّلٰوةِ وَ اصۡطَبِرۡ عَلَيۡهَا ؕ لَا نَسۡـَٔـلُكَ رِزۡقًا ؕ نَحۡنُ نَرۡزُقُكَ ؕ وَ الۡعَاقِبَةُ لِلتَّقۡوٰى ﴿۱۳۲﴾

اور اپنے گھر والوں کو نماز کا حکم دے اور خود اس پر قائم رہ۔ ہم تجھ سے رزق نہیں مانگتے ہم تجھے رزق دیتے ہیں اور اچھا انجام تقویٰ کے لیے ہے۔ (2123)

وَ قَالُوۡا لَوۡ لَا يَاۡتِيۡنَا بِاٰيَةٍ مِّنۡ رَّبِّهٖ ؕ اَوَ لَمۡ تَاۡتِهِمۡ بَيِّنَةُ مَا فِى الصُّحُفِ الۡاُوۡلٰى ﴿۱۳۳﴾

اور کہتے ہیں ہم پر ایک نشان اپنے رب کی طرف سے کیوں نہیں لے آتا۔ کیا ان کے پاس اس کی کھلی دلیل نہیں آ چکی جو پہلے صحیفوں میں ہے۔ (2124)

اور جس کا منہ روشن ہو (کیونکہ اَزْھَرْ چاند کو اور اَزْھَرَانِ سورج اور چاند کو کہتے ہیں) اور عورت کو زَھرَاء کہا جاتا ہے۔ اور نبی کریم ﷺ کی صفت میں ہے [أَزْهَرَ اللَّوْنِ] یعنی آپ کا رنگ سفید چمکدار تھا اور حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا الزَّهْرَاء کہلاتی ہیں۔

آرائش کے ظاہری سامان:

ان آیات میں خطاب عام ہے۔ اور اگر رسول اللہ ﷺ کو بھی خطاب سمجھا جائے تو اصل مقصود امت سے خطاب ہے جس کے سامنے یہ ﴿زَهْرَةَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا﴾ کے سامان آنے والے تھے۔ نبی کریم ﷺ کے سامنے ایسی قومیں نہ تھیں جنہوں نے دنیوی زندگی کی آرائش کو کمال تک پہنچایا ہو۔ یہ نقشہ آج یورپ ہماری آنکھوں کے سامنے پیش کرتا ہے اور اسی زمانہ کے مسلمان بالخصوص مخاطب ہیں کہ دوسری قوموں کے سامان زینت و آرائش وحسن کو دیکھ کر دنیا کے سامانوں کی طرف نہ جھک جائیں۔ اور فی الحقیقت ایسا ہی ہوا کہ آرائش ظاہری کی بیماری اور دنیا طلبی مسلمانوں میں بھی سرایت کر گئی ہے۔ یہاں تک کہ خدا کے آگے جھکنے کے لیے انہیں وقت بھی نہیں ملتا۔ اس کے بالمقابل رزق رب کا ذکر کیا جس سے مراد نبوت و ہدایت لی گئی ہے۔ مگر فی الحقیقت تمام وہ امور اس میں داخل ہیں جو روحانیت سے تعلق رکھتے ہیں۔

2123- اَهْلَ [دیکھو نمبر: 137]۔ یہ لفظ عام ہے اور صرف بیبیاں مراد نہیں۔ اگر خطاب رسول اللہ ﷺ سے لیا جائے تو آپ کے کل متبعین اس میں شامل ہیں۔ اور اگر عام ہے تو ہر شخص کے ساتھ اتحاد کا رنگ رکھنے والے لوگ اس میں داخل ہیں۔ اور یہ جو نماز کے ذکر کے ساتھ فرمایا کہ ہم تجھ سے رزق نہیں مانگتے تو مطلب یہ ہے کہ نماز سے اللہ تعالیٰ کو کوئی فائدہ نہیں پہنچتا، اس کی بڑائی اور عظمت زیادہ نہیں ہوتی۔ کیونکہ وہ کسی کا محتاج نہیں۔ بلکہ ﴿نَحْنُ نَرْزُقُكَ﴾ میں بتایا کہ یہ نماز انسان کے رزق روحانی کا موجب ہے اور نماز کی ہدایت کر کے اللہ تعالیٰ انسان کو اس کا اصل رزق دیتا ہے اور یہی وہ رزق ہے جو انجام کار کام آنے والا ہے۔ اسی کی طرف ﴿وَالْعَاقِبَةُ لِلتَّقْوٰى﴾ میں اشارہ ہے۔ اور اس طرف بھی کہ متقی کا انجام لازماً اچھا ہوگا۔

2124- **مطالبۂ عذاب ہلاکت کا لطیف جواب:** قرآن کریم کی طرز تبلیغ اعلیٰ درجہ کی حکمت پر مبنی ہے۔ جب ان کے سامنے

وَ لَوْ اَنَّاۤ اَهْلَكْنٰهُمْ بِعَذَابٍ مِّنْ قَبْلِهٖ لَقَالُوْا رَبَّنَا لَوْ لَاۤ اَرْسَلْتَ اِلَيْنَا رَسُوْلًا فَنَتَّبِعَ اٰيٰتِكَ مِنْ قَبْلِ اَنْ نَّذِلَّ وَ نَخْزٰى ﴿۱۳۴﴾

اور اگر ہم انہیں اس سے پہلے عذاب کے ساتھ ہلاک کر دیتے تو کہتے اے ہمارے رب کیوں تو نے ہماری طرف رسول نہ بھیجا تو ہم تیری آیتوں کی پیروی کرتے قبل اس کے کہ ہم ذلیل اور رسوا ہوتے۔ (2125)

قُلْ كُلٌّ مُّتَرَبِّصٌ فَتَرَبَّصُوْا ۚ فَسَتَعْلَمُوْنَ مَنْ اَصْحٰبُ الصِّرَاطِ السَّوِيِّ وَ مَنِ اهْتَدٰى ﴿۱۳۵﴾ ع 8 7 17

کہہ سب ہی انتظار کرنے والے ہیں سو تم بھی انتظار کرو پھر تم جان لو گے کہ کون سیدھے رستے پر چلنے والے ہیں اور کون ہدایت پر قائم ہیں۔

قوموں کی ہلاکتوں کا ذکر ہوتا ہے تو کہتے ہیں اس قدر قوموں کی ہلاکت کا جو ذکر ہمیں سنایا جاتا ہے ایسا ہی ایک نشان ہلاکت ہم پر کیوں نہیں لے آتا۔ ﴿بِاٰيَةٍ مِّنْ رَّبِّهٖ﴾ میں تنکیر نہ صرف نشان مطلوب کی عظمت کے لیے ہے بلکہ نکرہ لانے میں یہ بھی اشارہ ہے کہ جیسا نشانوں کا ذکر سنایا جاتا ہے ویسا کوئی ایک نشان استیصال ہم پر بھی لے آئے۔ اس کا جواب نہایت لطیف دیا ہے۔ ان کے پاس پہلے صحیفوں کا بَيِّنَةٌ یعنی رسول رحمۃ اللعالمین آ چکا ہے۔ یہ اس سے فائدہ کیوں نہیں اٹھاتے۔ جیسا کہ دوسری جگہ ﴿وَ قَالُوْا لَوْ لَاۤ اُنْزِلَ عَلَيْهِ اٰيٰتٌ مِّنْ رَّبِّهٖ﴾ [العنکبوت: 50:29] ''اور کہتے ہیں اس پر اپنے رب کی طرف سے نشان کیوں نہ اتارے گئے۔'' کا جواب دیا ہے ﴿اَوَ لَمْ يَكْفِهِمْ اَنَّاۤ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ يُتْلٰى عَلَيْهِمْ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَرَحْمَةً وَّ ذِكْرٰى لِقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ۝﴾ [العنکبوت: 51:29] ''کیا ان کے لیے یہ کافی نہیں کہ ہم نے تیری طرف کتاب اتاری ہے جو ان پر پڑھی جاتی ہے۔ یقیناً اس میں ان لوگوں کے لیے رحمت اور نصیحت ہے جو ایمان لاتے ہیں۔'' یعنی کتاب میں ان کے لیے رحمت موجود ہے، وہ اس سے فائدہ کیوں نہیں اٹھاتے۔ ایسا ہی یہاں ہے کہ پہلے صحیفوں میں رسول کریم ﷺ کا ذکر موجود ہے اور وہ کھلی دلیل اب ان کے پاس آ چکی ہے۔ کیونکہ پہلے صحیفوں کا بھی مصدق ہے اور بَيِّنَةُ رسول کریم ﷺ کو دوسری جگہ صفائی سے فرمایا ﴿لَمْ يَكُنِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ وَ الْمُشْرِكِيْنَ مُنْفَكِّيْنَ حَتّٰى تَاْتِيَهُمُ الْبَيِّنَةُ ۙ۝ رَسُوْلٌ مِّنَ اللّٰهِ يَتْلُوْا صُحُفًا مُّطَهَّرَةً ۙ۝﴾ [البینۃ: 98:1-2] ''وہ لوگ جو اہل کتاب میں سے کافر ہوئے اور مشرک (گناہ سے) باز نہ آنے والے تھے، یہاں تک کہ ان کے پاس کھلی دلیل آئے۔ اللہ کی طرف سے رسول جو پاک صحیفے پڑھتا ہے۔'' اور دوسرے یہ اشارہ بھی کیا ہے کہ جب پہلے صحیفوں کے مکذبوں پر عذاب آیا تو قرآن کریم کے جھٹلانے والے کیونکر اس سے بچ سکتے ہیں۔

2125- **عذاب اور رسول کا تعلق:** یہاں دو باتیں بیان فرمائی ہیں۔ اول یہ کہ مکذبین کا فساد اور شرارت تو پہلے ہی اس حد کو پہنچا ہوا

تھا کہ انہیں ہلاک کر دیا جاتا، مگر اتمام حجت ضروری تھا کہ رسول ان کے پاس آ جاتا۔ اس سے بھی معلوم ہوا کہ پہلی آیت میں بَیِّنَةُ سے مراد رسول ہی ہے اور دوسرے عذاب جو مکذبین نبی کریم ﷺ پر آنے والا تھا اس کی نوعیت بھی بیان فرما دی۔ ﴿اَنۡ نَّذِلَّ وَ نَخۡزٰی﴾ یہ عذاب ذلت اور رسوائی کا تھا۔ اسی میں ان کا استیصال اور یہی ان کی ہلاکت تھی کہ آخر کار اسی کے سامنے ذلیل اور مغلوب ہو کر آئے جس کو مٹانے کے درپے تھے۔ آخری آیت میں صاف کہہ دیا کہ الٰہی فیصلے کا انتظار کریں وہ آ کر رہے گا۔